دسترس

ساجد امروہوی

دسترس

مجموعۂ غزلیات

مرزا ساجد حسین ساجدؔ امروہوی

© جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں

ضابطہ

کتاب	:	دسترس
تخلیق	:	مرزا ساجد حسین ساجدؔ امروہوی
پتہ	:	محلّہ سدّو، امروہہ Mob: 09319361105
سرِ ورق	:	خسرو مرزا
اشاعت	:	۱۴۳۱ھ / ۲۰۱۰ء
تعداد	:	۴۰۰
طباعت		DIAMOND PRINTERS NEW DELHI 110002
ناشر	:	شعر و ادب سوسائٹی امروہہ
کمپوزنگ	:	سید ندیم اصغر زیدی
قیمت	:	۱۵۰ روپے

ملنے کے پتے

- خسرو مرزا E-173 پاکٹ 4، فیز-1، میور وہار، نئی دہلی
- خضر مرزا K.Com محلّہ سدو، امروہہ
- مرزا محمد زبیر ابن سیفی، دفتر انجمن یادگار رؤف، محلّہ سدو، امروہہ

زیست کے ملبوس میں ٹانک لئے مہر و ماہ
دامنِ احساس کی بخیہ گری رہ گئی

ساجد امروہوی

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	ضابطہ	۲
۲	انتساب	۷
۳	کوائف	۹
۴	مقدمہ، جناب مولانا سید محمد سیادت امروہوی	۱۰
۵	ذات وحیات کی سدابہار شاعری (پروفیسر ناشر نقوی)	۱۷
۶	مجموعۂ کلام "دسترس" ایک جائزہ (شجاع الدین فاروقی)	۲۷
۷	قطعہ ہائے تاریخ از قلم: جناب شمیم امروہوی	۴۵
۸	قطعہ ہائے تاریخ از قلم: جناب طرب ضیائی امروہوی	۴۶
۹	حمد	۴۹
۱۰	نعت شریف عالم ہُو میں جز خدا...؟ آئی صدا کوئی نہیں	۵۱
۱۱	نعت شریف دی ہے حضور کو صدا، تو نے گدائے مصطفےٰ	۵۳
۱۲	بن کے حدِ امتیاز بے ہنری رہ گئی	۵۵
۱۳	جلوۂ یار اگر نہیں دیکھا	۵۶
۱۴	جب جنوں کی کارفرمائی نہ تھی	۵۸
۱۵	گھر کا ماحول کچھ نیا ہے ابھی	۵۹
۱۶	ضبط کے دامن میں اب تار زیادہ نہیں	۶۱
۱۷	خود کو حصارِ ذات سے باہر نکال کے	۶۲
۱۸	بستی بستی بہتا ہے	۶۵

۱۹	مشکل میں مرے کام نہ آئے مرے اپنے	۶۷
۲۰	حضورِ دوست اگر باریاب ہو جائیں	۶۸
۲۱	وہ جنوں عطا ہو مجھ کو، مری آگہی کے بدلے	۶۹
۲۲	کوئی کہہ نہیں سکتا، کس طرف، کدھر تھا وہ؟	۷۰
۲۳	بے حسی راس آ گئی ہوگی	۷۲
۲۴	خار میری کہانیوں جیسا	۷۴
۲۵	شبِ غم کا سویرا چاہتا ہوں	۷۶
۲۶	نگہہِ رحمتِ حق یوں جو خفا ہم سے ہوئی	۷۸
۲۷	ظلم کی رد میں جو مصروفِ بیاں ملتے ہیں	۸۰
۲۸	قدریں بدل گئی ہیں، تقاضے بدل گئے	۸۲
۲۹	گر خوشی ہے تو عارضی کیوں ہے؟	۸۴
۳۰	اُمیدوں، آرزوؤں، حسرتوں کے گھر میں رہا	۸۶
۳۱	غم ہے اس دل کو سازگار بہت	۸۷
۳۲	یہ فلسفۂ ہستی تنہا کوئی کب جانا	۸۹
۳۳	اُس پر مفتوں جادو بھی	۹۰
۳۴	اپنے ہی قد سے بہرزاویہ اونچا ہو جاؤں	۹۱
۳۵	جلوۂ یار بھی تماشہ ہے	۹۳
۳۶	تیر کھائے ہیں روز و شب کتنے	۹۵
۳۷	اُس کو کسی صورت سے ممکن سمجھانا کب ہے	۹۷
۳۸	اپنی جبینِ شوق کو ستامت کر لینا	۹۹

۳۹	مری جبیں کو نصیب جب اُن کا آستاں تھا	۱۰۱
۴۰	دیدارِ یار کا ہُنر آتا نہیں مجھے	۱۰۳
۴۱	اشکِ ندامت میں ہے خوفِ خدا کی دلیل	۱۰۵
۴۲	مئے الست سے لبریز جام چاہتے ہیں	۱۰۷
۴۳	کوئی زمانے کی پروا نہ کچھ اَنا کا خیال	۱۰۹
۴۴	کوئی کیا کرے یہ تو اپنا اپنا نصیب ہے	۱۱۱
۴۵	یہ تو مجھے یقین ہے، سب سے تو وہ چھپا نہیں	۱۱۳
۴۶	عقل کی دوڑ دھوپ کا سارا اصلہ کچھ اور ہے	۱۱۵
۴۷	مجھے تو اُس سے اُمیدِ وفا ذرا بھی نہیں	۱۱۷
۴۸	اپنی پہچان گنوانے کا ہُنر کیوں چاہوں	۱۱۹
۴۹	یاد اُن کی اگر نہ آئے تو!	۱۲۰
۵۰	یہ مری زیست کا ساماں تو نہیں	۱۲۳
۵۱	کہیں یہ بات اک عالم نہ کہہ دے	۱۲۴
۵۲	دونوں جہاں میں کچھ بھی اگر چاہیئے مجھے	۱۲۵
۵۳	نہ کھائی چوٹ غمِ روزگار سے میں نے	۱۲۷
۵۴	ہر نظر طالبِ دیدار کہاں تھی پہلے	۱۲۸
۵۶	مجھ کو دیکھیں نہ مری راہِ گزر کو دیکھیں	۱۲۹
۵۷	اگر وہ مُسکرا دیں اپنے جی سے	۱۳۰
۵۸	غم سے خوش کوئی دکھائی نہیں دیتا یارو!	۱۳۲
۵۹	جب کبھی رہبر ہمارا جذبۂ کامل بنا	۱۳۴
۶۰	پا کر تری نظر کا اشارہ کبھی کبھی	۱۳۵

۶۱	اُن کی چشمِ ناز کو میں ایک پیمانہ کہوں	۱۳۶
۶۲	زباں ہماری سدا شکر آشنا ہی رہی	۱۳۷
۶۳	اُن کا منشا اگر ایسا ہے تو ایسا ہی سہی	۱۳۸
۶۴	رہِ حیات میں جب ہم وفا شعار چلے	۱۴۰
۶۵	مطمئن دورِ ہی منزل سے جو دیوانے ہیں	۱۴۱
۶۶	قسمت سے ذوقِ جہدِ مُسلسل اگر ملے	۱۴۲
۶۷	میری دنیا میں مسرّت کا پتہ بھی تو نہیں	۱۴۳
۶۸	اندھیارے آتے ہی نہیں، اپنی بستی کی فضاؤں میں	۱۴۵
۶۹	بڑے حسین مُقدّر اُنہوں نے پائے ہیں	۱۴۷
۷۰	سوچتے سوچتے تھک جائیں گے، میرے احباب	۱۴۸
۷۱	اے شمع تجھ کو آج یہ رُسوا کرے گا کیا	۱۵۰
۷۲	ترے بغیر ہر اک شے بُری لگے ہے مجھے	۱۵۲
۷۳	مہرباں مجھ پہ بہت ہی غمِ جاناں نکلا	۱۵۳
۷۴	جُرمِ اُلفت کی سزا کے وہ سزاوار نہیں	۱۵۴
۷۵	ان فضاؤں میں بھی جینے کی دعا دیتے ہیں	۱۵۶
۷۶	اُن کی تمنّا کرنے والے پہلے جاں قُربان کریں	۱۵۷
۷۷	کیوں یہ دستورِ زباں بندی تری محفل میں ہے	۱۵۹
۷۸	شامِ غربت ملے یا ظلمتِ صحرا آ جائے	۱۶۰
۷۹	ترانہ	۱۶۱
۸۰	علامہ اقبالؒ کو نذرِ عقیدت	۱۶۳

انتساب

اپنی شریکِ حیات قمر سلطانہ کے نام جنہوں نے
ہم سفری کے اکتالیس سال پورے ہوتے ہی مجھے تنہا
چھوڑ دیا۔

چہ چیز است بدتر ز مرگ آدمی را
بہ گفتا جدائی، جدائی، جدائی

ساجد امروہوی

کوائف

نام	مرزا ساجد حسین
تخلص	ساجدؔ
تاریخ پیدائش	۱۸ جنوری ۱۹۴۳ء
تعلیم	ایم. اے. انگریزی، ایم. اے. تاریخ ایم. اے. معاشیات، بی. ایس. سی.، بی. ایڈ رٹائرڈ، لکچرر، امام المدارس امروہہ
تلمّذ	والد گرامی حضرت رؤفؔ امروہوی برادرانِ مکرم سیفیؔ امروہوی و حامدؔ امروہوی
ارادت	حضرت ملاّ رضا حسینؒ مجمع السلاسل حضرت رؤفؔ امروہویؒ چشتی صابری (والد گرامی) حضرت سید معین الدین جعفریؒ عرف بابو میاں چشتی صابری
دیگر تصانیف	رازِ بخشش (مجموعہ نعت ۱۹۹۰ء) آرزوئے بخشش (مجموعہ نعت ۲۰۰۵ء) گہرِ بخشش (مجموعہ نعت و مناقب ۲۰۰۷ء)
مرتّب	انوارِ رؤف (۱۹۸۸ء)

مقدّمہ

جناب ڈاکٹر سید محمد سیادت نقوی
سابق صدر شعبۂ اردو
(جے ایس ہندو پوسٹ گریجویٹ کالج، امروہہ)
وامام جمعہ والجماعت شیعہ جامع مسجد
محلّہ شفاعت پوتہ امروہہ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ادب برائے زندگی کا نظریہ اُردو شاعری کی تمام ہی اصناف میں بالواسطہ یا بلا واسطہ ابتدا ہی سے کارفرما رہا ہے کوئی صنف ایسی نہیں جس میں خواہ جزوی طور پر ہی سہی، حیات اور اقدار حیات کو ملحوظ نہ رکھا گیا ہو لیکن تمام اصنافِ سخن میں صرف غزل ایک ایسی منفرد صنف ہے جس میں زندگی اور اس کے نشیب و فراز ہی کو موضوع بنایا جاتا رہا ہے، غزل ہی ایک ایسی اہم صنف ہے جس میں سماجی اقدار و مسائلِ حیات کو ہر زمانے میں موضوع قرار دے کر سماجی زندگی کی بھرپور ترجمانی کی گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ صنف غزل فارسی شاعری کے اوائلی دور سے لے کر اردو شاعری کے دور ثانی تک باعتبار موضوع محدودیت کی شکار رہی ہے یعنی غزل کو عصری تقاضوں کے پیشِ نظر صرف فلسفۂ تصوف و اخلاق کی توضیحات کے لئے مخصوص سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ عرصۂ دراز تک اخلاقی اقدار اور مسائل تصوف ہی غزل میں پیش کئے جاتے رہے ہیں لیکن سماجی حالات میں یکسر انقلاب آنے کے بعد عام طور پر زندگی کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ

نظریۂ حیات میں بھی انقلابی اثرات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ اقدار حیات میں واضح تبدیلیاں واقع ہونے لگیں اور حیات انسانی باقاعدہ وسعت پذیری کی طرف مائل ہوگئی تو غزل نے بھی اپنے محدود دائرے سے قدم باہر نکالا اور سماجی زندگی کو اپنا اساسی موضوع قرار دے کر سماج کی تغیر پذیر اقدار اور گوناگوں مسائل حیات کی ترجمان بن گئی۔

حقیقتاً تمام اصناف سخن میں صرف غزل کو اپنی جامعیت و ہمہ گیری کے سبب حیات انسانی اور اس کے گوناگوں مسائل کی ترجمانی کا شرف حاصل رہا ہے، غزل ہی کی پوری تاریخ سماجی اقدار اور روایات کی آئینہ دار رہی ہے چنانچہ اردو غزل کا کوئی نمائندہ شاعر ایسا نہیں نظر آتا جس نے اپنی فکری و فنی صلاحیتوں کے مطابق غزل کو سماج اور معاشرہ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔

اردو غزل ابتدا سے لے کر آج تک زندگی کے کیسے کیسے حولناک حادثات اور طوفان خیز تھپیڑوں کا مقابلہ کرتی رہی ہے اور کتنے زبردست سماجی انقلابات سے دوچار رہی ہے۔ لیکن اپنی اساسی خصوصیت غزل سے جس نے غزل کو دیگر اصناف میں ممتاز قرار دیا ہے کسی زمانے میں دستبردار ہوتی نظر نہیں آتی ہے۔

یوں تو ہر دور میں غزل گو شعراء کی ایک طویل فہرست پائی جاتی ہے لیکن ان بے شمار شعراء میں صرف انہیں چند فنکاروں کو حیات دوام میسر ہوئی ہے جنہوں نے اپنی عمیق نظری، جودت طبع اور پرواز تخیل کے ذریعہ اردو غزل

کو عصری تقاضوں کے مطابق مسائل حیات اور سماج کے درپیش نئے نئے موضوعات سے ہم آہنگ کرتے ہوئے فضائے بسیط عطا کی ہے۔

ان چند تمہیدی کلمات کی روشنی میں جب مرزا ساجد امروہوی کی غزلوں کو مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ساجد صاحب نے زندگی اور اس کے درپیش مسائل کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے اور زندگی سے متعلق تجربات ہی کو انہوں نے اپنے فن کا موضوع قرار دیا ہے، ساجد صاحب اگرچہ سائنس کے طالب علم رہے ہیں اور پیشے کے اعتبار سے بھی سائنس ہی کی تعلیم و تدریس آپ کا مشغلہ رہا ہے لیکن انہوں نے چونکہ خالص ادبی و علمی گھرانے میں آنکھ کھولی اور شاعرانہ فضاؤں میں پرورش پائی ہے اس لئے ان کے یہاں شعر فہمی و شعر گوئی کا سلیقہ بچپن سے ہی پایا جاتا ہے عمر کے ساتھ سلیقے میں بھی نکھار پیدا ہوتا ہے جسے ان کی شعر گوئی کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے۔ ساجد کو بحیثیت ایک سائنسی طالب علم انتہائی باریک بینی کے ساتھ تجزیۂ حیات کے ساتھ مسائل حیات کا مطالعہ کرنے کے بہتر مواقع فراہم ہوئے ہیں جسے انہوں نے اپنی غزلوں میں انتہائی خوبصورت پیرایۂ بیان میں پیش کیا ہے۔

ساجد صاحب کی غزلوں کے سرسری مطالعہ ہی سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ خالص غزل کے شاعر ہیں اور انہیں بنیادی طور پر غزل ہی سے وابستگی بھی رہی ہے اسی لئے غزل کو انہوں نے اپنے فن کی آماجگاہ قرار دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غزلوں کے علاوہ گھریلو ماحول کے

پیش نظر نعت و منقبت اور سلام وغیرہ بھی بکثرت انہوں نے لکھے ہیں جسے صرف وقت کی ضرورت ہی کہا جا سکتا ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ انہوں نے صرف اور صرف غزل ہی کو اپنی فنی و فکری صلاحیتوں کا محور قرار دیا ہے اس لئے کہ گھر کے شاعرانہ ماحول کے سبب پیدا ہوتے ہی کانوں کو لفظ غزل سے آشنائی ہوئی ہوش سنبھال کر اس وقت کے تمام ادبی حلقوں میں غزل ہی کی سحر تاثیری کے چرچے سنے اور خصوصاً اپنے والد ماجد جناب ماسٹر عبد الرؤف صاحب مرحوم کی زبان سے جن کا شمار امروہہ کے مقبول ترین نعت گو شعراء میں کیا جاتا ہے اور جو صنف نعت کی عظمت مقام کے صحیح عارف ہوتے ہوئے اپنی نعت کو ہمیشہ غزل ہی سے تعبیر کرتے رہے ہیں مسلسل غزل ہی کا نام سنا کیے اسی لئے غزل ہی کے نقوش ان کی فکر و ذہن پر مرتسم ہوتے رہے چنانچہ ان کی حمد ہو یا نعت، منقبت ہو یا سلام ہر مقام پر غزل ہی کا رنگ و آہنگ اور غزل ہی کا لب و لہجہ پوری طرح رچی بسی صورت میں نظر آتا ہے مثلاً حمد یہ نظم میں محبوب حقیقی سے بزبان غزل تخاطب کا انداز ملاحظہ ہو۔

کسی تمثیل و تواردسے مبرّا تو ہے
دہر میں ایسی کوئی شے نہیں جیسا تو ہے
سازِ بے صوت کے نغموں میں لہکتا تو ہے
لبِ خاموش کی آواز میں گویا تو ہے
کوئی کہہ نہیں سکتا، کس طرف کدھر تھا وہ
جسم تھا نہ سایہ تھا کچھ نہ تھا مگر تھا وہ

یا نعت میں اپنے والہانہ عشق اور محبوب کی محبوبیت پر فخر و مباہات کا سلیقہ دیکھئے۔

قلبِ حزیں نہ ہو اداس، وہ تو ہیں تیرے آس پاس
پیش کر اپنا التماس، دیکھ عطائے مصطفےٰؐ

یا ایک مقام پر عقل و عشق کے سربستہ رموز کو اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

عقل کا امتحان لے، ہوش کا راز جان لے
عشق کی بات مان لے، چوم لے پائے مصطفےٰؐ

ساجدؔ چونکہ فطرتاً ایک صوفی منش شاعر ہیں اسی لئے انہوں نے دنیا سے ماوریٰ تصوف کو اپنے لئے باعث فخر سمجھا ہے اور موجودہ دنیاوی نظریۂ تصوف کو ہدف ملامت بناتے رہے ہیں جس کی مثالیں ان کی غزلوں میں جا بجا نظر آتی ہیں۔

کم نظر مسند ارشاد پہ آتے ہیں نظر
ہاتھ ملتے ہوئے صاحب نظراں ملتے ہیں
شہر جنوں میں ہوتے تھے بیگانے آشنا
شہر خودی میں آئے تو اپنے بدل گئے
راہِ طلب میں دور تلک مشعلیں سی ہیں
شاید نقوشِ پا ہیں کسی باکمال کے

تصوف کی دنیا میں عرفان ذات کے مسئلے کو ابتدا ہی سے اساسی

حیثیت حاصل رہی ہے اس سلسلے میں تقریباً تمام متصوفین نے اپنی اپنی فکر و بصیرت کے مطابق اظہار خیال بھی کیا ہے۔ حقیقتاً فلسفۂ الٰہیات کا یہ ایک ایسا عمیق اور وسیع و عریض موضوع ہے جس کی حقیقت تک پہنچنا ہر کس و ناکس کی بات نہیں ہے۔ فارسی شاعری کی طرح اردو شاعری میں بھی تقریباً تمام غزل گو شعرائے متقدمین نے تصوف کے اس اہم مسئلے کو موضوعِ فن بنایا ہے۔ ساجدؔ نے بھی بحیثیت متصوف اسمیں اپنی وسعتِ فکر کے مطابق طبع آزمائی کی ہے چنانچہ اعتدال کے معنی بتانے کے لئے خود کو حصارِ ذات سے نکالنے کی تلقین اس طرح کرتے ہیں۔

خود کو حصارِ ذات سے باہر نکال کے
معنی بتا رہا ہوں حدِ اعتدال کے

ساجدؔ نے موروثی طور پر چونکہ اسلاف کی روایت کو ورثے میں پایا ہے اس لئے روایت پرستی ہی کو انہوں نے اپنے لئے طرۂ امتیاز سمجھتے ہوئے خالص روایتی انداز و آہنگ میں ایسے تمام موضوعات و مضامین کو انتہائی چابک دستی کے ساتھ اپنی غزل کا موضوع بنایا ہے۔ جیسا کے اردو شاعری میں عموماً اپنوں سے فریب خوردگی کا شکوہ کیا جاتا رہا ہے اسی شکوے کو انہوں نے اپنی غزلوں میں مختلف انداز سے دُہرایا ہے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

پھر کبھی دیکھ لیں گے غیروں کو ہمیں اپنوں کا سامنا ہے ابھی

مشکل میں مرے پاس نہ آئے مرے اپنے
گرتی ہوئی دیوار کے سائے مرے اپنے

جس سمت سے پھینکے گئے پتھر مری جانب
نکلے وہیں غیروں کے بجائے مرے اپنے

ساجدؔ نے سماجی زندگی کا مطالعہ بہت قریب سے کیا ہے اسی لئے ان کی غزلوں میں ایسے مسائل حیات جن پر عموماً نظر نہیں پہنچ پاتی ہے نہایت برجستگی کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ مثلاً

خشک ہو گئیں آنکھیں تب ہوا ہے یہ احساس
گر گیا تھا جو آنسو ناز چشمِ تر تھا وہ

وقت گزرے گا بھول جاؤ گے — یہ بچھڑنا نیا نیا ہے ابھی
کیوں ہڑک پُپ ہے اس قدر ساجدؔ — کیا کوئی حادثہ ہوا ہے ابھی

اپنی گفتگو کو ختم کرتے ہوئے اپنے دوست مرزا ساجدؔ امروہوی کی خدمت میں ان کے مجموعۂ غزلیات کی اشاعت کے سلسلے میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور بارگاہِ خداوندی میں دست بہ دعا ہوں کہ۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

☆☆☆☆☆

ذات وحیات کی سدا بہار شاعری

پروفیسر (ڈاکٹر) ناشر نقوی
صدر، شعبۂ فارسی اردو
پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ، پنجاب

تہذیبِ شاعری کے فکری سرمائے میں تصورِ ذات ایک اہم عنصر ہے۔ اس وجودی فکر کی بنیاد لا الٰہ الاّ اللہ ہے جس کو صوفیائے عظام نے ہمہ اوست قرار دیا ہے۔ مرتبۂ ذات میں حقیقتِ اعلیٰ واحد ہے اور مرتبۂ صفات میں متنوع اُردو کی فلسفیانہ شاعری کا تعلق ہی وجودی فکر سے ہے خواجہ میر درد، غالبؔ اور اقبالؔ کی کل شاعری تلاشِ چشمِ حقیقت کے حوالے سے عالم مجاز کی جستجو ہی تو ہے جسے ہم اعلیٰ وارفع کہہ رہے ہیں۔ وجودی فکر اور شاعری کے حوالے سے ہمارے عہد میں جو اہم نام ابھرتے ہیں ان میں ایک نام مرزا ساجدؔ امروہوی کا بھی ہے جو ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مزاج سے درویش و قلندر، عادات و اطوار سے جنوں خیز، ہوش مند ملنگ اور پیشے سے معلم ہیں۔ مرزا ساجدؔ نے شعری اور مذہبی ہر صنف سخن کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ اپنے اظہار میں انہوں نے جس احتیاط کو قدر مشترک بنایا ہے وہ اپنے خدا کے وجود کا اثبات اور اپنے وجود کی نفی یہی وہ وجودی فکر ہے جو انہیں دوسروں کے درمیان الگ شناخت دیتی ہے۔ ساجدؔ کے یہاں کفر اور کفارے کا نہیں، بخشش کا سرمایہ ہے۔ شعریت کے ایسے سرمایہ دار شاعر کی طرف اس کی "آرزوئے بخشش" کشش کا سبب بنتی ہے۔

مرزا ساجد امروہوی نصف صدی سے اردو شاعری کی تقدیس سے وابستہ ہیں۔ موصوف کے تین شعری مجموعے "بخشش" کو ہی کلیدی سرمایہ بنا کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ "راز بخشش"، "گہر بخشش" اور "آرزوئے بخشش" ان تینوں مجموعوں کی روحانی اور متصوفانہ شاعری اس یقین کا اظہار ہے جو انسان کی خلقت کو معنویت دیتا ہے۔ شاعری کیوں کہ عرفان ذات کا ہی وسیلہ ہے اس لئے اسے مرزا ساجد امروہوی نے عشق اور خود سپردگی کی بلندیوں پر جا کر پرکھا ہے۔ عشق حقیقی میں پہلی محبوب ذات خالق کی ہے چنانچہ ساجد نے اپنے زیر نظر شعری مجموعے میں پہلے اسی محبوب سے گفتگو کی ہے۔

ساز بے صوت کے نغموں میں لہکتا تو ہے
لب خاموش کی آواز میں گویا تو ہے
حمد کرنے کے لئے وسعت الفاظ ہے تنگ
جبکہ ہر ظاہر و باطن کا خلاصہ تو ہے
تیرا عرفاں ہے اگر کچھ، تو وہ دیوانوں کو
فلسفہ دانوں کے نزدیک معمہ تو ہے

کسی بھی کتاب کو پڑھنے سے پہلے ہر قاری ابتدائی ورق گردانی کر کے اپنی دلچسپی ڈھونڈھتا ہے اس فطری عمل سے جب میں دوچار ہونے بیٹھا تو دوچار ہی نہ ہو سکا مجموعہ کے مشمولات نے مجھے ایک ہی نظر میں سمٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ مذکورہ حمد کے پہلے ہی شعر میں علم البیان اور صنائع لفظی و معنوی کی خوبیوں نے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ 'ساز بے صوت' کے ساتھ 'نغمہ'

لب خموش کے ساتھ 'آواز' اور پھر 'گویا' لفظیات کا اہتمام و التزام اپنی معنویت میں سبب کشش بن گیا۔ اگلے شعر میں بھی وہی حسن 'وسعت' لفظ کے ساتھ 'تنگ' اور خلاصہ وغیرہ وغیرہ۔ زبان و بیان کی اس معجز نگاری کے ساتھ ساتھ مرزا ساجد امروہوی کی سہل ممتنع میں روانی کہیں تھمتی نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مرزا ساجد جس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں اس میں شاعری ہمیشہ اوڑھنا بچھونا رہی ہے اور دوسری وجہ سامنے کی ہے کہ موصوف کو شعر کہتے ہوئے آدھی صدی کا عرصہ گزر چکا ہے۔

زیر نظر مجموعۂ کلام مرزا ساجد امروہوی کی انتخابِ غزلیات کا ہے جس کے آغاز میں متذکرہ حمد اور نعت رسول کو بھی تبرک کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ غزل بقول رشید احمد صدیقی اردو شاعری کی آبرو ہے اب اسی میں روایتی اور جدید کا امتیاز ہونے لگا ہے جبکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ غزل ہی کیا ہر صنف ادب جدید ہی ہوتی ہے۔ تخلیق کار جو بھی تخلیق کرتا ہے وہ تخلیق کے وقت جدید ہی ہوگی۔ یہی جدید تخلیق مثال بنتے بنتے روایت بنتی ہے۔ میر و غالب بھی اپنے زمانے کے جدید شاعر تھے اور میں اور مرزا ساجد بھی اپنے وقت میں جدید شاعر ہیں، ہمیں جدید اور قدیم کی بحث سے قطع نظر کر کے شاعری میں تین باتوں کو پرکھنا چاہیئے اولاً یہ کہ اپنی شاعری میں شاعر نے نئے تجربات و مشاہدات سے ہمیں بہرہ مند کیا ہے یا نہیں، دوسرے یہ کہ زبان و بیان میں کشش اور سادگی موجود ہے یا نہیں، تیسری اہم بات یہ کہ شاعری کی سماجی افادیت ہوتی ہے شاعری میں یہ افادیت بے جا نہیں۔ اچھی شاعری

کرنے اور سمجھنے کا میرے خیال سے تو یہی پیمانہ ہے۔ اس پیمانے کے مطابق ہی میں نے مرزا ساجد امروہوی کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ زیر نظر مجموعے کی بیشتر غزلوں میں شاعر کے سچے جذبات اور تجربات و مشاہدات پر مضبوط گرفت ہے جس سے مؤثر شاعری کا تانا بانا تیار ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ساجد امروہوی کے یہ شعر۔

گردشِ وقت سے کہو ٹھہرے ان کے ہاتھوں میں آئینہ ہے ابھی
ضد ہے بچوں کی سی ابھی اس میں دل ہر اک چیز مانگتا ہے ابھی
جو لب پر ہے وہ مجبوری ہے میری جو دل میں ہے وہ کہنا چاہتا ہوں

وہ میرے اندر سے ہو کے گزرے سنا ہے میں نے
پتہ نہیں مجھ کو جانے اس وقت میں کہاں تھا

مذکورہ اشعار میں نے اس مجموعے سے ایک ایک کر کے نہیں چنے ہیں ہر غزل میں ایسے اشعار ملتے چلے جائیں گے۔ مرزا ساجد امروہوی نہ سطحی سوچتے ہیں اور نہ سطحی بولتے ہیں۔ نجیب الطرفین خاندانوں کی طرح شاعری بھی نجیب الطرفین ہوتی ہے۔ مرزا ساجد کے متذکرہ اشعار اس کی دلالت کر رہے ہیں۔ دل کا ہر ایک چیز مانگنا فطری امر ہے اور جو چیز فطری ہو اس میں عقل کو دخل نہیں ہوتا۔ فطرت معصوم ہوتی ہے۔ اسی معصومیت کو مرزا ساجد نے مذکورہ شعر میں 'بچوں کی سی ضد' سے تعبیر کر دیا اور جب اس فطرت کا اظہار کیا تو زبان کی معصومیت کو یہاں بھی برقرار رکھا ہے۔

مرزا ساجد امروہوی انسانی نفسیات کے بھی پارکھ ہیں۔ ہر انسان

ایک دوسرے کی اچھائی اور برائی کے پیش نظر سماج میں جو اظہار کر رہا ہے وہ حقیقت سے قریب ہو کر تو کرتا ہے حقیقت میں نہیں کرتا۔ مثلاً ہر فرد 'ثالث' بننے کا تو خواہش مند ہے مگر نصف نہیں بن پاتا۔ مرزا ساجد امروہوی نے انسان کی اس کمزوری کو خود پر اوڑھا اور کہا ؎

جو لب پر ہے وہ مجبوری ہے میری جو دل میں ہے وہ کہنا چاہتا ہوں

اچھا اور سچا شاعر، 'جو دل میں ہے وہ کہنا چاہتا ہوں' ہی کہے گا لیکن خون کے اور سماج کے رشتے اس کے اظہار کا گلا گھوٹتے رہتے ہیں۔ 'جو دل میں ہے' کہہ کر مرزا ساجد نے ہمت تو دکھائی۔ موجودہ دور میں تو ہر شخص دو چہروں میں جی رہا ہے۔

مرزا ساجد امروہوی کی شخصیت اور شاعری کے منظر نامے سے میں کافی حد تک واقف ہوں۔ موصوف کالج میں میرے استاد بھی رہے ہیں۔ میں اکثر کہتا ہوں کہ مرزا ساجد امروہوی کی اگر پوری زندگی کو شاعری تسلیم کر لیا جائے تو اس شاعری کا ایک مصرعہ میں بھی ہوں۔ یعنی ان کا ایک مصرعہ میری صورت میں اردو کا ایک پروفیسر ہے۔ میری طرح کتنے ہی ان کے شاگرد دوسری یونیورسٹیوں میں پڑھا رہے ہیں۔ کتنے ہی سائنسدان اور انجینئر مرزا ساجد امروہوی کے شاگرد ہیں۔ ایک شاعر کی کامیابی یوں بھی تو عیاں ہوتی ہے۔ کالج کے زمانے میں مرزا ساجد نے سائنس اور حساب کے استاد ہونے کے باوجود اردو کی ایک نسل تیار کی۔ جس کا میں بھی ایک فرد ہوں۔ یہ بھی تو مرزا ساجد امروہوی کی ہوش مند شاعری کا ثبوت ہے۔

مرزا ساجد امروہوی کی غزلوں میں جو تہہ داری، رمزیت اور اشاریت ہے وہ معنی و مفہوم کے حوالے سے قاری کو بہت کچھ دکھاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ شاعری کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ ہر شعر مکمل تکنیکی آگہی کے ساتھ وجود میں آیا ہے۔ ساجد کی غزلوں میں سے یہ احساس اجاگر ہوتا ہے کہ شعر میں کہی گئی بات کا ارتقاء خود بخود نہیں ہوتا بلکہ موصوف پہلے سے سوچ سمجھ کر بات کے اٹھان پر غور کرتے ہیں اور زبان کے مطالعے، آہنگ، قوافی، ترتیب، ساخت اور موقع و محل کے مطابق ادلتے بدلتے نقش و نگار، تجنیس صوتی اور غیر صوتی کے اثر کو بھی پہلے سے سوچ لیتے ہیں۔ اسی لئے ان کے طرز بیان میں اعجاز پیدا ہو جاتا ہے مثلاً۔

یہ خود سے پوچھیں کہ بکھرے تو کیا ملا ہم کو
جو اپنے آپ کو ہم دستیاب ہو جائیں

ہم خود کو کر ہی پائے تھی شائستہ حیات
اتنے میں زندگی کے تقاضے بدل گئے

مرزا ساجد امروہوی کی غزل داد اور بے داد کی نہ خواہاں ہے اور نہ محتاج۔ یہ وہ شاعری ہے جو انسانوں کی بھیڑ میں آئینہ رکھتی ہے تاکہ جس کا جیسا چہرہ ہے اسے ویسا ہی نظر آئے۔ عام طور پر آدمی کو اپنی ہی صورت دیکھنے کا وقت نہیں ملتا اور وہ دوسرے سے خوبصورت ہونے کی غلط فہمی میں شب و روز گزارتا رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مرزا ساجد کے کلام میں شعور کی روشنی ہے لاشعور کے لامتناہی سلسلوں کی غیر واضح داخلیت نہیں ہے۔ ان

کے یہاں جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ہے تکنیک اور اظہار۔ ساجدؔ کی ایسی کتنی ہی غزلیں ہیں جن کے ایک ایک مصرعے میں حسنِ تضاد کے ساتھ دو دو باتیں اظہار کی موسیقیت کے ساتھ ملتی ہیں۔

بن کے حدِ امتیا، بے ہنری رہ گئی
روٹھ گئی آگہی، بے خبری رہ گئی
گلشنِ احساس پر، برق گری بار بار
شاخِ تمنا مگر، پھر بھی ہری رہ گئی

☆☆☆☆☆

راہِ وفا پر خطر، ذکرِ وفا بے اثر
ترکِ وفا کا مگر، کوئی ارادہ نہیں
غم تو رہِ زیست کا، ایک پڑاؤ ہے بس
غم کوئی منزل نہیں، غم کوئی جادہ نہیں

☆☆☆☆☆

وہ جنوں عطا ہو مجھ کو، مری آگہی کے بدلے
کہ میں غم قبول کرلوں، بخوشی خوشی کے بدلے
مرے دل کی سادہ لوحی کا، یہ رخ بھی تو نے دیکھا
تیری یاد سے لئے ہیں، تری بے رخی کے بدلے

شاعری کی یہ وہ زبان ہے جو تاثر اور شعر دونوں کو آفاقیت عطا کرتی ہے۔ میرؔ و غالبؔ اردو غزل کے اس لئے سب سے بڑے شاعر مانے گئے کہ

انہوں نے عوام کی زبان میں شاعری کی۔ غالب کے یہاں اگر مشکل پسندی ابھری اور معنی و مطالب سامنے نہ رہ کر گہرائی میں چلے گئے تو ان کے ایسے اشعار نے عوام سے رشتہ توڑ لیا۔ 'تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد' والی غالب کی غزل سے عوام کا رشتہ استوار نہیں ہو سکا البتہ 'دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے' سے سب واقف ہیں۔ مرزا ساجد امروہوی اس معیار قبولیت سے واقف ہیں اس لئے ان کے یہاں نہ تو فارسیت ہے اور نہ لفظوں کی عمیقیت، دل کی بات کو دل تک بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچانے میں ہی مرزا ساجد یقین رکھتے ہیں۔ داغ کی طرح ان کی یہ کامیاب کوشش بھی رہتی ہے کہ سہل ممتنع کے ساتھ ساتھ اگر بات محاورے میں آجائے تو سونے پر سہاگہ ہوگا۔ مکالماتی غزل کہنے میں تو مرزا ساجد زبان و بیان پر دسترس رکھتے ہیں مثلاً۔

تم جو سچ بولنے کے عادی ہو — جھوٹ کا بوجھ سہہ نہ پائے تو
میں جسے یاد ہی نہیں کرتا — وہ اگر مجھ کو بھول جائے تو
تم کو ہے زندگی سے پیار بہت — زندگی تم سے روٹھ جائے تو

مرزا ساجد امروہوی کے یہاں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ایسی بحروں کا انتخاب کرتے ہیں جن میں موسیقیت شامل رہے۔ موصوف کیوں کہ خود مترنم شاعر ہیں اس لئے غنائیت کی یہ جستجو بھی قاری سے اپنائیت کا رشتہ بنا لیتی ہے ایک اور انفرادیت یہ بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہ مرزا ساجد امروہوی اپنے قاری کو ایسی ردیف میں گرفتار کر لیتے ہیں جو ذات کا منظر نامہ مرتب کرنے لگتی ہے۔ تقریباً چالیس برس پہلے مرزا ساجد سے جب میں نے یہ

غزل سنی تھی تو مجھے بھی یاد ہو گئی تھی۔

مشکل میں مرے پاس نہ آئے، مرے اپنے
گرتی ہوئی دیوار کے سائے، مرے اپنے
جس سمت سے پھینکے گئے پتھر مری جانب
نکلے وہیں غیروں کے بجائے، مرے اپنے

مجھے اس بات کا فخر ہو رہا ہے کہ مرزا ساجد امروہوی جواب غزل سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر دو قدم تصوف کی طرف بڑھ گئے تھے انہوں نے ہمارے اصرار مسلسل کی لاج رکھ لی اور پھر غزل کے حسن نکھارنے پر توجہ مرکوز کر لی ہے تصوف شاعری کا ایمان ہے۔ تصوف آدمی کو انسان کامل بننے کا وسیلہ ہے۔ اس وسیلے سے غزل کے موضوعات رسیلے ہوتے ہیں مرزا ساجد نے متصوفانہ غزل کہہ کر سماعتوں کو وجدان بھی دیا ہے اور عرفان بھی۔

فلسفۂ عقل و فہم آج تلک بے اساس
عشق کا ذوق جنوں اپنی بقا کی دلیل
کوئی کہہ نہیں سکتا، کس طرف، کدھر تھا وہ
جسم تھا نہ سایا تھا، کچھ نہ تھا، مگر تھا وہ
وہ میرے اندر سے ہو کے گزرے، سنا ہے میں نے
پتہ نہیں مجھ کو جانے اس وقت میں کہاں تھا

مرزا ساجد امروہوی کی غزل اکیسویں صدی میں جہاں غزل کی پاسدار ہے وہاں غلام ہمدانی، مصحفی امروہوی، استادِ میر سعادت امروہوی

اور جون ایلیا کے اسلوب کی بھی توثیق ہے۔ امروہہ کی شاعری میں نہ لکھنوی مبالغہ ہے اور نہ دہلوی مرثیہ۔ اس سرزمین کے شاعر عشق میں ذوق جنوں لے کر اپنے بعد کی نسل کو کچھ سوچنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ مرزا ساجد امروہوی نے بھی اس روایت کو قائم رکھا ہے۔

اگلی نسلوں کے حوالے مجھے کچھ کرنا ہے
اس سے پہلے کہ میں ماضی کا حوالہ ہو جاؤں
عشق کا نام رہے مجھ پہ وفا ناز کرے
جس کا اک بار میں ہو جاؤں اسی کا ہو جاؤں

مرزا ساجد امروہوی کے اس مجموعۂ کلام کے منظر عام پر آنے کی شاید ان سے زیادہ خوشی ان کے ان نیاز مندوں کو ہوگی جو غزل کی تہذیب کو سرسبز و شاداب دیکھنا چاہتے ہیں ایسے چاہنے والوں میں میں بھی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مرزا ساجد امروہوی کا یہ شعری سرمایہ ادب میں محفوظ و مقبول ہوگا۔

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرّحمن الرّحیم

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسلہٖ الکریم

"ساجدؔ امروہوی اور ان کا مجموعۂ کلام "دسترس"۔ایک جائزہ"

امروہہ کو بجا طور پر ایوانِ شاعری کہا گیا ہے اور یہ خطاب وسند اُن اہل لکھنؤ کی جانب سے ہے جو اپنی زبان دانی اور فہمِ شعر وسخن کے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ اپنی ادبی شوکت و عظمت کے باوجود ایک حد تک امروہہ کا ممنون ومقروض رہا ہے کیوں کے اہل لکھنؤ کے استاد اور وہاں کی ادبی بہاروں کے ہیرو۔ مصحفیؔ بہر حال امروہوی تھے۔ امروہہ کے ایک مشاعرے میں اسی حقیقت وممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے محشرؔ لکھنوی نے کہا تھا۔

امروہہ در حقیقت ایوان شاعری ہے
مولد ہے مصحفیؔ کا محشر ذرا سنبھل کر

اسی ایوان شاعری کا مرکز اور نمائندہ خانوادۂ رؤفؔ ہے جس نے نہ صرف امروہہ میں بلکہ اردو ادب خصوصاً نعت ومناقب کے میدان میں اپنی انفرادیت وخصوصیت کا لوہا منوالیا ہے۔ حضرت رؤفؔ نے نہ صرف نعت ومناقب کے میدان میں اپنا مخصوص نقش ثبت کیا اور نخلۂ محامد، گلرنگ تخیل اور کوثر رحمت جیسے گراں قدر شعری مجموعے یادگار چھوڑے ہیں بلکہ ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ نعتیہ نشست کا اہتمام کر کے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ نشست تقریباً گذشتہ پچاسی (۸۵) سال سے بلا ناغہ منعقد ہو رہی ہے۔

موسم کی سختیوں اور حالات کی ستم ظریفیوں نے کسی جمعہ کو اسے مختصر تو کر دیا ہوگا لیکن ناغہ کبھی نہیں کر سکی ہوں گی کیوں کہ ایسے حالات میں ان کے اہل خانہ نے مل کر ہی اس فریضہ کو بہر حال انجام دیا ہے۔

حضرت رؤف اس نعتیہ نشست کے مہر منیر تھے تو ان کے سعادتمند صاحبزادگان سیفی، حامد اور ساجد - عطار دوزہرہ ومشتری کی حیثیت رکھتے ہیں جو اُن سے اکتساب نور کر کے نعت ومناقب کے چراغاں کر رہے ہیں۔ یہ حضرات، حضرت رؤف (متوفی ۱۹۸۶ء) کے بعد بھی اس سلسلہ کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا قائم کردہ جلسۂ نعت خوانی اسی اہتمام کے ساتھ اب بھی منعقد ہو رہا ہے۔ تینوں صاحبزادگان ذی وقار اپنے والد گرامی کے خیالات ونظریات وافکار واعمال اور شعری وادبی انداز نظر کے پابند اور مقلد ہیں خصوصاً ساجد امروہوی نے اس میں اختصاص حاصل کیا ہے کیوں کہ وہی ان کے جانشین ہیں اور تمام معاملات میں ان کی مکمل تقلید کر رہے ہیں۔ رؤف صاحب نے اپنی زندگی میں ہی ساجد امروہوی کو درگاہ حضرت حافظ عباس علی صاحبؒ کے سجادہ نشین حضرت ملا رضا حسین صاحبؒ کا مرید کرا دیا تھا جو مجمع السلاسل تھے۔ امسال ہی اس درگاہ کے موجودہ متولی اور سجادہ نشین حضرت حافظ احمد حسین صاحب مدظلہٗ العالی نے ساجد صاحب کو خلافت عطا فرمائی ہے۔ رؤف صاحب کے تینوں صاحبزادگان ہی شاندار نعت ومناقب کہہ رہے ہیں۔ امروہہ کی شعری نشستوں کی رونق بن رہے ہیں اور شعری مجموعے طبع کرا رہے ہیں۔

دسترس

مرزا ساجد حسین ساجد امروہوی حضرت رؤف کے چوتھے صاحبزادے ہیں (ولادت ۱۸ جنوری ۱۹۴۳ء) بی ایس سی۔بی ایڈ۔ کرنے کے بعد امام المدارس انٹر کالج امروہہ میں استاد کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ دوران تدریس انگریزی، تاریخ اور معاشیات میں ایم اے کئے اور اسی کالج سے بحیثیت لکچرر ریٹائر ہوئے۔ ولادت کے بعد شاید اذان کے ساتھ ہی نعتیہ اشعار کانوں میں پڑے ہوں گے اس لئے شعر وسخن خصوصاً نعت ومناقب کا ذوق فطری اور پیدائشی ہے۔ خوش گلو، خوش آواز اور خوش فکر ہیں اور یہ سب عطیۂ خداوندی ہے۔ حصول علم کے بعد ذریعۂ معاش کے لئے سائنس پڑھاتے رہے اور اپنے ذوق کی تکمیل کے لئے نیز سکون قلب کے لئے نعت ومناقب کہتے رہے اور داد سخن پاتے رہے۔

جناب ساجد امروہوی دینی میلان، مذہبی جوش وجذبے کے حامل اور اہل تصوف سے تعلق خاطر رکھنے والے ہی نہیں خود تصوف کی طرف عمیق میلان رکھنے والے شاعر ہیں ایسے لوگ اس دنیا سے زیادہ اُس دنیا کی فکر میں سرگرداں وکوشاں رہتے ہیں۔ انہیں اس عارضی زندگی کے مقابلے میں دائمی زندگی کی زیادہ فکر ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ اس کے عیش وآرام اور حصول جنت کے لئے حسن عمل میں لگے رہتے ہیں کیوں کہ حسن عمل ہی انہیں مغفرت، رحمت اور بخشش سے شادکام کراتا ہے۔ اسی لئے ساجد کو بھی آرزوئے بخشش ہوئی۔ شدت آرزو نے انہیں راز بخشش سے آگاہ کیا اور جب بخشش کا راز معلوم ہو گیا تو گہرِ بخشش ان کی دسترس میں تھا۔ اسی لئے وہ

اس مجموعے کے ذریعے اپنی دسترس کا اظہار کررہے ہیں۔

رازِ بخشش، آرزوئے بخشش اور گہر بخشش ان کی نعت ومناقب کے مجموعے ہیں جو اہل سخن سے دادِ سخن وصول کر چکے ہیں اور پسندیدہ نظروں سے دیکھے گئے ہیں۔ انہوں نے کبھی کبھی غزلیں بھی کہی ہیں۔ انہیں کا مجموعہ دسترس کی صورت میں پیش خدمت ہے۔ فی الوقت اسی کے چند اشعار کا جائزہ مقصود ہے۔

ساجد کی غزلیں روایتی انداز کی نہیں ہیں۔ وہ حسن وعشق کے معاملات، گل وبلبل کی داستانوں اور فرضی محبوب کے فراق میں کہے گئے اشعار سے عبارت نہیں ہیں بلکہ غالبؔ، اقبالؔ اور اصغرؔ گونڈوی کی غزلوں کی طرح قرآن واحادیث، فلسفہ وتصوف، پند وموعظت اور اخلاق ونصیحت کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان کے یہاں اگر محبوب ہے تو وہ واضح طور پر حقیقی ہے، جس سے وہ اپنے واردات قلبی بیان کرتے ہیں، شکوہ وشکایت بھی کرتے ہیں اور اسی سے استمداد واستعانت بھی چاہتے ہیں۔

"دسترس" کی ابتدا حسب روایت حمد ونعت سے ہوئی ہے۔ ابتدا میں دس اشعار پر مشتمل ایک حمد ہے جس میں ذات واحد کی حمد وثنا، اس کی قوت وقدرت اور اوصاف حمیدہ کا بیان ہے۔ حمد کے بعد دو نعتیں ہیں پہلی میں گیارہ اور دوسری میں دس شعر ہیں۔ ان رسمی وروایتی اور عقیدت ومحبت پر مشتمل اشعار کے بعد غزلوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے ان کی کل تعداد ۶۷ سڑسٹھ ہے اور ان میں شامل اشعار کی تعداد ۵۳۳ ہے آخر میں ایک ترانہ وطنی

وطنی اور ایک نظم بند را قبال ہے۔ ان کی سب سے چھوٹی غزل تین اشعار پر مشتمل ہے اور سب سے بڑی سترہ اشعار پر ہے۔ بقیہ تمام غزلوں کے اشعار کی تعداد ان کے درمیان ہی ہے۔

✿ ایک حدیث پاک میں ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا۔ اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ ظاہر ہے کہ جو خود کو ہی نہیں سمجھ سکا وہ رب کو کیا سمجھے گا۔ اسی خیال کو ساجد نے اس طرح شعری جامہ پہنایا ہے۔

اپنے عرفان سے عرفان خدا بھی ہوتا
خود کو سمجھے نہیں تکفیر انا ہم سے ہوئی

✿ زندگی آرزوں، تمناؤں اور حسرتوں سے عبارت ہے۔ یہ ایک طرف ترقی و کامیابی کا وسیلہ ہیں تو دوسری طرف رشک و رقابت، مقابلہ آرائی اور دوسروں کو نقصان پہنچا کر بھی اپنا فائدہ کرنے کی طرف راغب کرتی ہیں۔ انسان ہمیشہ آرزوں اور تمناؤں سے گھرا رہتا ہے۔ ایک آرزو کی تکمیل نہیں ہونے پاتی کہ دوسری شدت سے ابھرتی ہے۔ اسی لئے وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ 'بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے' ساجد بھی اسی احساس سے گزرتے ہوئے کہتے ہیں۔

گلستان حیات کیسا ہے — گل بہت کم ہیں اور خار بہت

امیدوں، آرزوں، حسرتوں کے گھر میں رہا
میں ساری عمر گلستان بے شجر میں رہا

ان کا علاج اگر ہے تو صرف قناعت میں۔ اسی لئے قناعت کی بڑی تعریف کی گئی ہے اور اس کو سب سے بڑی دولت قرار دیا گیا ہے۔ ہندی میں کیا خوب کہا گیا ہے۔

گئو دھن، گج دھن، بج دھن، رتن دھن کھان
جب آوے سنتوش دھن سب دھن دھر سمان

(گائے، ہاتھی، گھوڑے، ہیرے، جواہرات دولت کی قسمیں ہیں لیکن اصل دولت تو قناعت کی دولت ہے۔ اس کے سامنے سب ہیچ ہیں)

تکالیف اور پریشانیوں کی وجہ ہماری خواہشات ہیں۔ ترک خواہشات ہی نجات کا ذریعہ ہے۔

قناعت سے ہی نفس مطمئنہ حاصل ہوتا ہے اور جسے اللہ تعالیٰ نفس مطمئنہ عطا فرما دیتا ہے تو اس کی زندگی تمام پریشانیوں اور کلفتوں سے پاک ہو جاتی ہے۔ وہ راضی برضا رہتا ہے۔ اسے کچھ حاصل ہونے پر بہت زیادہ خوشی نہیں ہوتی اور کچھ ضائع ہو جانے پر بہت زیادہ تکلیف نہیں ہوتی۔ وہ ہر حال میں خوش اور مطمئن رہتا ہے اور رضائے الٰہی کی جستجو کرتا ہے۔ اسی لئے ساجد اس کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

خدا سے اپنے فقط نفس مطمئن چاہو
یہ مال و زر تو سبھی خاص و عام چاہتے ہیں

☼ ہر بات میں قیل و قال کی جا سکتی ہے لیکن کوئی شخص بھی بقائمی ہوش و حواس یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس دنیا میں ہمیشہ رہے گا۔ اس لئے کہ ہر وقت کھلی

آنکھوں سے نظر آتا ہے کہ امیر، فقیر، بوڑھے اور جوان سب راہ عدم کی طرف چلے جا رہے ہیں، لیکن پھر بھی انسان زیادہ سے زیادہ وقت اس دنیا میں گزارنا چاہتا ہے اور یہ کوشش کرتا ہے کہ اسے دوام حاصل ہو جائے کم سے کم اس کا نام ہی باقی رہے۔ اگر کچھ اچھا کام کیا ہے تو یقیناً وہ عزت و نیک نامی کا باعث بنتا ہے ورنہ رسوائی اور بدنامی ضرور مقدر ہوتی ہے۔ یہ نام و کام بھی ایک عرصہ تک باقی رہتا ہے۔ وقتی و عارضی ہی ثابت ہوتا ہے۔ بڑے بڑے بادشاہوں، ناموروں اور اہل ہنر کے کام بھی ایک زمانے کے بعد گوشۂ گمنامی میں چھپ جاتے ہیں۔ دوام تو صرف ذات واحد کو ہی حاصل ہے۔ اسی لئے اس خام خیالی پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے ساجد کہتے ہیں۔

ہجوم راہ عدم دیکھنے کے بعد بھی لوگ
فنا پذیر جہاں میں دوام چاہتے ہیں

اس فنا پذیر جہاں میں عزت و شہرت اور زر و مال وقتی اور عارضی ہوتے ہیں اور اس مختصر وقفہ میں بھی عروج و زوال سے گزرتے رہتے ہیں اسی لئے ساجد ان کے خواہاں نہیں بلکہ ایسی دائمی زندگی کے آرزومند ہیں جو زوال نا آشنا ہو، جو گردش لیل و نہار اور ماہ و سال کے چکر سے ماوریٰ ہو ظاہر ہے عقیدے کے مطابق ایسی دائمی زندگی تو بس جنت کی زندگی ہی ہو سکتی ہے۔ ساجد اسی کے آرزومند ہیں۔

خواہاں نہ شہرتوں کے نہ زر کے نہ مال کے
جھگڑوں سے ہم ہیں دور عروج و زوال کے

جس کا کوئی شمار ہو وہ زندگی ملے
یہ عمر تو شمار میں ہے ماہ و سال کے

☼ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اشک ندامت کی بڑی قدر ہے۔ متعدد احادیث میں ارشاد گرامی ہے کہ اگر بندہ بڑے سے بڑے گناہ کے بعد بھی صدق دل سے توبہ کرتا ہے اور تنہائی میں خصوصاً "آہ سحر گاہی میں "اللہ کے حضور توبہ و استغفار کے ساتھ اشک ندامت لے کر حاضر ہوتا ہے تو اللہ اس کے ہر گناہ کو بخش دیتا ہے۔ اقبال نے اپنے ابتدائی دور کی شاعری میں اس خیال کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا تھا۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

ساجدؔ بھی اشک ندامت کو خوف خدا کی دلیل اور عفو خطا کی سند مانتے ہیں۔

اشک ندامت میں ہے خوفِ خدا کی دلیل
آہِ سحر گاہ ہے عفو خطا کی دلیل

اشک انفعال جس بڑی کامیابی سے ہم کنار کرتے ہیں اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے مرے اشکِ انفعال تو نے کیا مجھے نہال
فرد گنہ کو دھو دیا جرم بچا کوئی نہیں

آنسو بجائے خود ایک نعمت ہیں ان کی قدر و قیمت کا احساس تب

ہوتا ہے جب دل کے اندر غم کا طوفان ہو اور آنکھیں محروم اشک۔ آنسو ہی اس طوفان کو دور کرنے کا وسیلہ بنتے ہیں بصورت دیگر خود وجود انسانی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اس کیفیت کو فانی بدایونی نے بڑے موثر انداز سے پیش کیا ہے۔

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

ساجد بھی اس کیفیت سے گزر کر آنسو کی قدر و قیمت کا احساس کرتے ہیں۔

خشک ہو گئیں آنکھیں تب ہوا ہے یہ احساس
گر گیا تھا جو آنسو نازِ چشم تر تھا وہ

یہ آنسو اگر اشک ندامت نہ بھی ہوں تو بھی انسان کے لئے بڑے مفید ہیں۔ درحقیقت یہ گرمیٔ احساس اور شدت غم کو کم کرنے کا وسیلہ ہیں۔ آنسو نکل کر دل کے بوجھ کو کم کر دیتے ہیں اور غم و یاس کی آگ کو بجھا دیتے ہیں۔ اسی لئے غالب نے کہا تھا۔

"روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں؟"

ساجد بھی انہیں اسی لئے عزیز رکھتے ہیں۔

میرے آنسو ہی فقط ساتھ مرا دیتے ہیں
دل میں جو آگ بھڑکتی ہے بجھا دیتے ہیں

اہل تصوف کے نزدیک دل آزاری بہت ہی بڑا گناہ ہے۔ وہ ہمیشہ "دل بدست آور کہ حج اکبر است" پر یقین رکھتے ہیں اور یہ کوشش

کرتے ہیں کہ نہ صرف دل آزاری سے بچا جائے بلکہ دل دہی اور دلداری کی کوشش کی جائے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ جسم کا زخم تو بھر جاتا ہے لیکن دل پر لگی چوٹ کا اثر کبھی زائل نہیں ہوتا۔ اسی لئے ساجدؔ بھی کہتے ہیں ؎

ہوتا نہیں ہے محو کبھی دل شکن سخن
تم آئینے سے بال دکھا دو نکال کے

وار ہوتے ہیں زباں کے کہیں چہروں سے عیاں
شیشۂ دل پہ کھرونچوں کے نشاں ملتے ہیں

✿ ساجدؔ کے یہاں مکمل خود سپردگی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے تمام معاملات اپنے مالک و معبود پر چھوڑتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ جو کرے گا بہتر ہی کرے گا ؎

مری اپنی کوئی مرضی نہیں ہے ترا ہوں تیرا چاہا چاہتا ہوں

ڈور ہے جس کے ہاتھ میں سب ہے اس کی مرضی پر
گتھی کو اُلجھانا کب ہے سلجھانا کب ہے

وہ اپنی کمیوں، کوتاہیوں و محرومیوں کو بھی اپنی ہی شامت اعمال کا نتیجہ مانتے ہیں اور ان کا الزام بھی اپنے ہی سر لیتے ہیں۔ یہ بھی خود سپردگی اور مالک و معبود کے لئے انتہائی ادب و احترام کی علامت ہے ؎

نگہہ رحمت حق یہ جو خفا ہم سے ہوئی
کچھ نہ کچھ، کوئی نہ کوئی تو خطا ہو سے ہوئی

صرف اخلاق کی قدروں کی یہ ناقدری ہے
اتنی برگشتہ جو تاثیر دعا ہم سے ہوئی
اپنے عرفان سے عرفان خدا بھی ہوتا
خود کو سمجھے نہیں تکفیر انا ہم سے ہوئی

☼ غم جاناں اور غم دوراں کا ذکر شعرا نے شدت سے کیا ہے۔ ان کا حساس و دردمند دل یاس و محرومی اور حسرتوں و آرزوں کی پامالی کو شدت سے محسوس کرتا ہے اور اس کا اظہار شعری پیکر میں کرتا ہے۔ ساجد کے یہاں بھی ان سب کا اظہار ہوا ہے اور خوب ہوا ہے لیکن وہ زندگی سے مایوس و بددل نہیں بلکہ وہ زندگی کو فطرت کا تقاضہ اور فرض سمجھ کر گزارنا چاہتے ہیں۔

زیست کو بار سمجھنے کا نہیں کوئی جواز
زیست فطرت کا تقاضہ ہے کوئی بار نہیں

☼ اللہ کے سادہ دل بندے بڑی مصیبت میں ہیں وہ مذہبی طبقوں کے ہاتھوں بھی لٹتے ہیں اور سیاسی رہنماؤں کے ذریعہ بھی بے وقوف بنائے جاتے ہیں اور استحصال کا شکار ہوتے ہیں اسی لئے اقبال نے خدا سے فریاد کرتے ہوئے کہا تھا۔

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے... کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

ساجد بھی ان طبقوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اس کو اُجرت لینی ہے بس اپنی خطابت کی
واعظ کا مقصد لوگوں کو سمجھانا کب ہے

کم نظر مسند ارشاد پہ آتے ہیں نظر
ہاتھ ملتے ہوئے صاحب نظراں ملتے ہیں
عقل سے دور کم نظر کم علم مگر انداز گیانیوں جیسا
زمین دوز تخیل دماغ ٹخنوں میں
یہ پستہ قد بھی تو اعلیٰ مقام چاہتے ہیں
ہمارے عہد کے یہ ننگ قوم اپنے سوا
ہر ایک شخص کو بے ننگ و نام چاہتے ہیں

بہر حال اللہ کی مصلحتیں اور انداز بڑے نرالے اور اکثر نا قابل فہم ہوتے ہیں اسی لئے ہر دور کے اہل نظر کو یہ شکایت رہی کہ کم نظر و کم ظرف اور کم علم و فہم اپنی عیاری و مکاری کے سہارے اعلیٰ مناصب حاصل کر لیتے ہیں اور اہل علم و فضل منھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ حافظ شیرازی جیسے رندی و سرمستی کے شاعر کے یہاں بھی یہ درد ایک غزل میں بالآخر ابھر ہی آیا ہے اور وہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیر پالاں
طوق زریں ہمہ در گردن خرمی بینم

(عربی گھوڑا کاٹھی کے بوجھ سے زخمی ہو رہا ہے اور سونے کا طوق

گدھے کی گردن میں دیکھ رہا ہوں)

✿ غالبؔ اور اقبالؔ کی غزلوں میں استفہامیہ انداز بطور خاص پایا جاتا ہے دراصل یہ استفہامیہ انداز ہر ذی شعور کے یہاں موجود ہوتا ہے ایسا شخص، یہ کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟ اور یہ کیوں نہیں ہے؟ کے سوالوں میں گھرا رہتا ہے پھر بھی اکثر ایسے سوالات لاینحل ہی رہتے ہیں۔ ساجدؔ کے یہاں بھی تیرہ اشعار پر مشتمل ایک غزل اسی انداز کی ہے۔

گر خوشی ہے تو عارضی کیوں ہے؟ اور غم ہے تو دائمی کیوں ہے؟
غم ہے جب زینت جہانِ خیال غم نہ ہونے کی پھر خوشی کیوں ہے؟
ساری آسائشیں مہیا ہیں پھر پریشان آدمی کیوں ہے؟
مطمئن کارگاہِ ہستی میں میں نہیں ہوں تو کوئی بھی کیوں ہے؟
سب کو ہمدرد کیوں سمجھتے ہو تم میں اس درجہ سادگی کیوں ہے؟

حضرت رؤفؔ نے کہا ہے۔

جن کو ملتی ہے حقیقت کی خبر ان کے لب پہلے سئے جاتے ہیں

حقیقت یہی ہے کہ جنہیں عرفان الٰہی ہو جاتا ہے وہ عالم تحیر میں آجاتے ہیں اور خاموشی اختیار کر لیتے ہیں لیکن عرفان الٰہی بچوں کا کھیل نہیں کہ ہنستے کھیلتے حاصل ہو جائے۔ یہ تو ہفت خواں طے کرنے اور سنگلاخ وادیوں کو عبور کرنے کے بعد عبادت و ریاضت کی سخت راہوں سے گزرنے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے اور جب حاصل ہو جاتا ہے تو تمام غیوب، حضور کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ہر شے اس کے سامنے آئینہ ہوتی ہے لیکن آئینے کی

خصوصیت یہ ہے کہ وہ دیکھتا اور دکھاتا ہے، بول نہیں سکتا، بتا نہیں سکتا۔ تصوف کے انہیں عمیق معاملات کو ساجد نے سادہ و سلیس انداز میں اس طرح نظم کیا ہے۔

یہ تو مجھے یقین ہے سب سے تو وہ چھپا نہیں
جن کو پتہ ہے یار کا ان کا کوئی پتہ نہیں
ہے جسے اس کی معرفت اس کا وجود آئینہ
آئینہ دیکھتا تو ہے آئینہ بولتا نہیں

✿ ذات واحد کا نقش ہر دل اور ہر خیال میں مرتسم ہے۔ کہیں دھندلا اور کہیں صاف و شفاف جن دلوں اور خیالوں میں یہ نقش دھندلا ہے، ان کا تو کیا ذکر لیکن جہاں کہیں صاف و شفاف ہے تو بھی فہم انسانی اسے کماحقہٗ سمجھ نہیں سکتی اور بیان تو بالکل بھی نہیں کر سکتی۔ اسی لئے اکبر الہ آبادی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا۔

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا　　میں جان گیا بس تری پہچان یہی ہے

ایک اور موقع پر کہتے ہیں:

"جو سمجھ میں آ گیا پھر وہ خدا کیوں کر ہوا؟"

ساجد کہتے ہیں۔

لوح خیال پر ہے نقش بے خط و خال ایک شکل
حدِ بیاں سے پار ہے فہم سے ماوریٰ نہیں

اسی طرح ہر شخص کی آرزو ہوتی ہے کہ وہ اپنے معبود و مسجود کا دیدار

کرے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر رسول کو بھی "ارنی" (میں ترا دیدار چاہتا ہوں) کے جواب میں "لن ترانی" (تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے) سننا پڑا تھا اور اصرار پر ایک جھلک دکھائی گئی تو غش کھا کر گر پڑے۔ یہ خصوصیت تو صرف سرور کائنات، فخر موجودات نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی حاصل ہوئی کہ انہوں نے چشم سر سے مسکراتے ہوئے اپنے رب کا دیدار کیا اور قرآنی الفاظ میں "مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی" (نہ آنکھ ادھر ادھر ہوئی اور نہ حد سے بڑھی)

(سورۂ النجم پارہ ۲۷ آیت نمبر ۱۷)

دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے فارسی میں کیا خوب کہا گیا ہے۔

موسیٰ زہوش رفت بیک پرتو جمال　　تو عین ذات می نگری در تبسمے

اسی لئے ایک عبد ضعیف دیدار الٰہی کی تمنا کی ہمت بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اسے اپنی حد معلوم ہے کہ وہ ہرگز جلوۂ حسن یار کی تاب نہیں لا سکتا۔ اسی لئے ساجد کہتے ہیں۔

جلوۂ حسن یار کی تاب کہاں سے لاؤں گا
حسرت دید کیا کروں، دید کا حوصلہ نہیں

وہ جلوۂ حسن یار، کے تمنائی تو ہیں لیکن بقدر ظرف نظر۔

مثل کلیم ہوش نہ اڑ جائیں اے خدا!　　جلوہ بقدر ظرف نظر چاہئے مجھے

غالبؔ نے چند مسائل تصوف بیان کر کے کہا تھا کہ اگر وہ بادہ خوار نہ ہوتا تو ولی سمجھا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مسائل تک رسائی اسی کی ہو سکتی ہے جو "دل بیدار" کا حامل ہو، جس کے یہاں اپنے محبوب کے لئے جنون

کی کیفیت ہو، جو مکمل طور پر اپنے مالک و معبود و مسجود کے سامنے سپر انداز ہو چکا ہو اور راضی برضا کے اصول پر قائم ہو (حضرت ملا رضا حسینؒ کے مرید و معتقد کو ایسا ہی ہونا چاہیئے) اسی کے خیالات میں گہرائی و گیرائی آتی ہے اور پھر وہ وہی کہتا ہے جو اس کے معبود و مسجود کی مرضی و منشا کے مطابق ہوتا ہے۔ ساجد اس منزل سے گزر کر ہی کہتے ہیں۔

جب جنوں کی کارفرمائی نہ تھی　　میری باتوں میں یہ گہرائی نہ تھی

ہاتھ میں اس کے سرا پردۂ اسرار نہیں
جس کے سینے میں متاع دل بیدار نہیں
وہ بھی کیا آنکھ ڈھلیں جس میں نہ موتی غم کے
وہ بھی کیا دل کہ جو لذت کش آزار نہیں

دسترس سے یہ چند نمونے "مشتے نمونہ از خروارے" کے مصداق ہیں۔ جب دسترس آپ کی دسترس میں ہوگی تو اس کا پورا لطف حاصل کیا جا سکے گا۔ امید اور دعا ہے کہ جناب ساجد کا یہ مجموعہ بھی ان کے سابق مجموعوں کی طرح قبول عام اور بقائے دوام حاصل کرے۔ اللہ تعالیٰ ان کی حمد و نعت و مناقب کے عوض انہیں گہر بخشش سے شاد کام فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین و رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین۔

شجاع الدین فاروقی
۲۵ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ
علی گڑھ مطابق ۱۹ جولائی ۲۰۰۹ء

عرضِ حال

اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اردو کے کسی بھی شاعر کی شعری تخلیق کی ابتدا غزل سے ہی ہوئی ہے۔ میرے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوا ہے مگر میں اپنے والد بزرگوار کے شغفِ نعت اور ہر جمعہ کو انعقادِ محفلِ نعت سے متاثر ہو کر نعتیں زیادہ کہنے لگا اور غزلیں کم۔

بیس سال پہلے تک میں نے امروہہ اور امروہہ سے باہر غزل کے بہت سے مشاعروں میں شرکت کی مگر اس کے بعد طبیعت کا میلان نعت و منقبت کی جانب مڑ گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار تو تقریباً سال بھر تک ہر جمعہ کو میں نے نئی نعت پڑھی۔ والد گرامی کے داد دینے کا جو مشفقانہ اور پدرانہ انداز ہوتا تھا میں اُسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ جب نعتوں کی تعداد تقریباً ایک کتاب کے قابل ہو گئی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم کتاب ترتیب دو ہم چھپوائیں گے۔ لیکن افسوس! میرا پہلا مجموعۂ نعت 'رازِ بخشش' ان کے وصال کے بعد چھپ سکا۔ اس کے علاوہ نعت و مناقب کے دو مجموعے 'آرزوئے بخشش' اور 'گہر بخشش' بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

امروہہ کے طرحی منقبتی اور نعتیہ مشاعروں کے انعقاد نے بھی طبیعت کو اُدھر ہی مہمیز رکھا، اسی درمیان کبھی کبھی کوئی غزل بھی ہو جاتی تھی اسی لئے غزلوں کی تعداد میں معتد بہ اضافہ نہ ہو سکا میری غزلیہ شاعری میں پندرہ بیس

سال کا گیپ (تعطل) قارئین خود ہی محسوس کرلیں گے۔ غزلوں کی تعداد کم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے شاعری کو کبھی پیشہ ورانہ انداز میں نہیں اپنایا حالانکہ لاتعداد مقامی اور بیرونی مشاعروں میں شرکت کی۔

میں اپنے دیرینہ کرم فرما جناب ڈاکٹر سید محمد سیادت صاحب کا نہایت ممنون و متشکر ہوں کہ انہوں نے اپنے بیش قیمت وقت کو میرے لئے صرف کیا اور مقدمہ سے نوازا۔ اُن کے علاوہ میرے پاس ڈاکٹر ناشر نقوی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ قارئین اُن کے مضمون سے ہی اُن کے محبت و احترام کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی صاحب کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے مزاج کی ناسازی کے باوجود ایک پرمغز مقالہ تحریر فرمایا ہے۔

آخر میں اپنے برادران گرامی جناب سیفی امروہوی اور جناب حامد امروہوی کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے 'دسترس' کو قارئین کرام کے ہاتھوں تک پہنچانے میں میری امداد فرمائی۔ میں جناب محترم طرب ضیائی اور جناب شمیم نقوی کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے قطعات تاریخ سے نوازا۔ بارگاہِ رب العزت میں دعا گو ہوں کہ وہ میرے ان سب پر خلوص معاونین کے درجات میں اضافہ فرمائے اور انہیں تادیر بہ سلامتِ ایمان و صحت قائم رکھے۔ (آمین)

خادمِ ادب

ساجد امروہوی

قطعہ ہائے تاریخ

از قلم: جناب شمیم امروہوی

(۱)

(صنعت مہملہ یا غیر منقوطہ)

یہ نسخۂ غزل ہے لہجے زباں کے چمکے
افکار معتبر ہیں اس میں کئی برس کے
اس کا سنہ طباعت یہ ہے شمیم کہہ دو
حرزِ ہنروری ہیں اسرار دسترس کے

۱۴۳۰ ہجری

(۲)

۱۴۳۰ھ چودہ سو تیس ہجری تکمیل سنہ ہے اس کا۔۱۴۳۰ھ
۲۰۰۹ء ٹھیری ہیں بیس صدیاں آ کر نویں برس میں۔۲۰۰۹ء
۱۴۳۰ھ تصویرِ دسترس نے یہ سالِ طبع کھولا۔۱۴۳۰ھ
۲۰۰۹ء جہدِ غزل بھی آئی ساجد کی دسترس میں۔۲۰۰۹ء

۲۰۰۹ عیسوی

قطعہ ہائے تاریخ

از قلم: جناب طربؔ ضیائی امروہوی

مجموعۂ چہارم "نورِ ماہِ سخن" مرزا ساجد امروہوی

۲۰۰۹ء

تحفۂ غزلیاتِ ساجد

۲۰۰۹ء

"دسترس" بتوفیقِ حق

۱۴۳۰ھ

گل دستۂ فن دسترس ہے
صد رشکِ چمن دسترس ہے

پُر آب ہیں اشعارِ ساجدؔ
خورشید بدن دسترس ہے

اک جرعہ میں سیراب ہو طبع
داروئے کہن دسترس ہے

اربابِ ادب کہہ رہے ہیں
پھولوں کی پھبن دسترس ہے

تاریخ اشاعت، طربؔ لکھ
تسنیمِ سخن دسترس ہے

۲۰۰۹ء

(۲)

بحرِ ہستی کی روانی دسترس
پیاس کے عالم میں پانی دسترس

بھائی ساجدؔ کا چمکتا شاہکار
ارمغانِ کہکشانی دسترس

نقشِ اول اُن کی نعت و منقبت
فکر کا ہے نقشِ ثانی دسترس

کھل اُٹھی قرطاس پر قوسِ قزح
ارغوانی، آسمانی، دسترس

حُسن کی عشوہ طرازی کا بیاں
عشق کی رنگیں کہانی دسترس

جس سے حاصل ہو سماعت کا سرور
وہ ربابِ خوش بیانی دسترس

جذبۂ دل سے منور ہر غزل
دل پہ دل کی حکمرانی دسترس

عشقِ صادق، جس سخن کی ہے اساس
اُس سخن کی ہے جوانی دسترس

رنگ بھر دے جو خزاں موسم میں بھی
نطق کی وہ گل فشانی دسترس

بہرِ تاریخِ طباعت کہہ طربؔ
گنجِ اسرارِ معانی دسترس

۱۴۳۰ھ

☆☆☆☆☆

حمد

کسی تمثیل و توارد سے مبرّا تو ہے
دہر میں ایسی کوئی شے نہیں جیسا تو ہے

سازِ بے صوت کے نغموں میں لہکتا تو ہے
لبِ خاموش کی آواز میں گویا تو ہے

کون کہتا ہے ہر اک آنکھ سے چھپتا تو ہے
خود سے جو غیر ہیں ان کو نظر آتا تو ہے

'نحنُ اقرب' کے جھروکے سے جھلکتا تو ہے
میرا ہمدم ہے مرے ساتھ ہی رہتا تو ہے

حمد کرنے کے لئے وسعتِ الفاظ ہے تنگ
جب کہ ہر ظاہر و باطن کا خلاصہ تو ہے

تیرا عرفاں ہے اگر کچھ تو ہے دیوانوں کو
فلسفہ دانوں کے نزدیک معمّہ تو ہے

کیا کروں میں متعیّن تری حیثیت کو
اک نئی شان میں ہر پل نظر آتا تو ہے

تیری جانب میں کبھی رخ نہیں کرتا لیکن
چاہنے والا مجھے سب سے زیادہ تو ہے

ہر گھڑی رہتا ہے تیری ہی طرف روئے سخن
میرا مولا، مرا آقا، مرا داتا تو ہے

تو ہی خالق بھی ہے مسجود بھی، معبود بھی تو
اپنے ساجد کے ہر اک سجدے کا منشا تو ہے

☆☆☆☆☆

نعت شریف

عالم ہُو میں جو خدا . . .؟ آئی صدا کوئی نہیں
ثانیِ مصطفیؐ کوئی . . .؟ حق نے کہا کوئی نہیں

تم ہو حبیب کبریاؑ، میں ہوں ذلیل و پُر خطا
تم سے بھلا کوئی نہیں، مجھ سے برا کوئی نہیں

لب پر درود کا ہو وِرد، رحمتِ حق ہو اِرد گرد
کُلفتِ روح کا علاج، اسکے سوا کوئی نہیں

دیکھ لیا ہے بارہا، غور کیا ہے بارہا
ہم سے تو ہیں ہزار ہا، اُنؐ سا ہوا کوئی نہیں

اے مرے اشکِ انفعال، تونے کیا مجھے نہال
فردِ گنہ کو دھو دیا، جُرم بچا کوئی نہیں

گُنبدِ سبز کی جھلک، گندھ گئی یوں پلک پلک
پھر تو زمیں سے عرش تک، حُسن بچا کوئی نہیں

ایسے بھی لوگ ہوگئے، عشقِ نبیؐ میں کھوگئے
قبروں میں جاکے سوگئے، نام ، پتہ کوئی نہیں

حق نے جو کچھ کہا، کہا، تم نے جو کچھ سُنا، سُنا
تم جو کہو وہ سب بجا، اور تو تھا کوئی نہیں

قوم ہے آج ہر طرف، ضربتِ کفر کا ہدف
ایسے زوال کا سبب اس کے سوا کوئی نہیں

منہ میں جو آیا کہہ دیا، دل میں جو آیا کر لیا
پاسِ نبیؐ کوئی نہیں، خوفِ خدا کوئی نہیں

آپؐ کو جو لبھا سکے، آپ کا قُرب پا سکے
ساجدِ بے کمال میں ایسی ادا کوئی نہیں

☆☆☆☆☆

نعت شریف

دی ہے حضورؐ کو صدا، تو نے گدائے مصطفیٰؐ
چشمِ یقین کھول کر دیکھ! وہ آئے مصطفیٰؐ

عقل کا امتحان لے، ہوش کا راز جان لے
عشق کی بات مان لے، چوم لے پائے مصطفیٰؐ

جب وہ ہیں سب کے واسطے، قاسمِ نعمتِ خدا
تم بھی گدائے مصطفیٰؐ، ہم بھی گدائے مصطفیٰؐ

حق کے لئے کفن بدوش، رہتے ہیں اب بھی اہلِ ہوش
سنتے ہیں گوشِ حق نیوش، اب بھی صدائے مصطفیٰؐ

یوں تو ہیں بے شمار یار، خاص ہیں اُن میں چار یار
سب میں ہے علم و حلم و عدل، صدق و صفائے مصطفیٰؐ

نور کا ایک انعکاس، ہے رگِ جاں کے آس پاس
ہوگا بہ ایں عطائے خاص، کون سوائے مصطفیٰؐ

فرقِ مراتب آپؐ کے، پیشِ نظر سدا رہے
سر بحضورِ حق جھکے، قلب بہ پائے مصطفیٰؐ

قلبِ حزیں نہ ہو اُداس، وہ تو ہیں تیرے آس پاس
پیش کر اپنا التماس، دیکھ عطائے مصطفیٰؐ

ایک اِدھر معینِ دیں، ایک اُدھر محی دیں
یہ بھی ادائے مصطفیٰؐ، وہ بھی ادائے مصطفیٰؐ

ساجدِ عاصی و ذلیل، غرقِ گناہ بے دلیل
حشر میں اُس کا ہے وکیل، کون؟ سوائے مصطفیٰؐ

☆☆☆☆☆

بن کے حدِ امتیاز بے ہنری رہ گئی
روٹھ گئی آگہی بے خبری رہ گئی

جلوہ گری حُسن کی، کیوں نہ رہے نا پذیر
خوش نظری اٹھ گئی، کم نظری رہ گئی

گلشنِ احساس پر برق گری بار بار
شاخِ تمنا مگر، پھر بھی ہری رہ گئی

بے عملی سے ملی، مملکتِ بے حسی
سلطنتِ دل چھنی، در بدری رہ گئی

زیست کے ملبوس میں، ٹانک لئے مہر و ماہ
دامنِ احساس کی بخیہ گری رہ گئی

☆☆☆☆☆

جلوۂ یار اگر نہیں دیکھا
تو نے کچھ چشمِ تر نہیں دیکھا

یاد اب تو نہیں رہا یہ بھی
کتنی مدت سے گھر نہیں دیکھا

زندگی ان کے ساتھ آئی تھی
پھر اسے عمر بھر نہیں دیکھا

اُن کو جاتے اُدھر سے دیکھا تھا
پھر کبھی سوئے در نہیں دیکھا

در بدر اے مصیبتو! کیوں ہو؟
تم نے کیا میرا گھر نہیں دیکھا

ہے گلابوں میں بس شباہتِ گُل
تم نے زخمِ جگر نہیں دیکھا

ہائے تقدیرِ چشمِ مضطر کی
وہ جدھر تھے اُدھر نہیں دیکھا

غمِ محبوب کے سوا ساجدؔ
کوئی غم معتبر نہیں دیکھا

☆☆☆☆☆

جب جنوں کی کارفرمائی نہ تھی
میری باتوں میں یہ گہرائی نہ تھی

مستقل آنسو ہی آنسو، غم ہی غم
زندگی اتنی تو راس آئی نہ تھی

بھیڑ میں مجھ کو بکھرتا چھوڑتی
اتنی ظالم میری تنہائی نہ تھی

زندگی ایسا لطیفہ تھا جسے
سوچنے پر بھی ہنسی آئی نہ تھی

☆☆☆☆☆

گھر کا ماحول کچھ نیا ہے ابھی
ڈر مجھے خود سے لگ رہا ہے ابھی

میرا دشمن ہے مجھ سے خوفزدہ
مجھ میں ہنسنے کا حوصلہ ہے ابھی

پھر کبھی دیکھ لیں گے غیروں کو
ہمیں اپنوں کا سامنا ہے ابھی

جانے کس دور میں جنوں پہنچے
موسمِ گُل کی ابتدا ہے ابھی

کچھ ہواؤں کی بھی شرارت ہے
کچھ وہ گیسو بھی کج ادا ہے ابھی

گردشِ وقت سے کہو، ٹھیرے
اُن کے ہاتھوں میں آئینہ ہے ابھی

ضد ہے بچوں کی سی ابھی اس میں
دل ہر اک چیز مانگتا ہے ابھی

کیا کرے گی بھلا اذانِ سحر
شہر کا شہر سو رہا ہے ابھی

وقت گذرے گا بھول جاؤ گے
یہ بچھڑنا نیا نیا ہے ابھی

کیوں سڑک چُپ ہے اس قدر ساجدؔ
کیا کوئی حادثہ ہوا ہے ابھی

☆☆☆☆☆

ضبط کے دامن مین اب تار زیادہ نہیں
شکوۂ احباب کا پھر بھی ارادہ نہیں

غم تو رہِ زیست کا ایک پڑاؤ ہے بس
غم کوئی منزل نہیں، غم کوئی جادہ نہیں

بادِ صبا آئے گی، بوئے وفا کے بغیر
صحن کشادہ سہی، ذہن کشادہ نہیں

راہِ وفا پُر خطر، ذکرِ وفا بے اثر
ترکِ وفا کا مگر، کوئی ارادہ نہیں

اے دلِ خانہ خراب، میں نے یہ دیکھا ہے خواب
گردشِ ایام کی، عمر زیادہ نہیں

☆☆☆☆☆

خود کو حصارِ ذات سے باہر نکال کے
معنی بتا رہا ہوں حدِ اعتدال کے

خواہاں نہ شہرتوں کے، نہ زر کے، نہ مال کے
جھگڑوں سے ہم ہیں دور، عروج و زوال کے

راہِ طلب میں دور تلک مشعلیں سی ہیں
شاید نقوشِ پا ہیں، کسی باکمال کے

زخمِ جگر تو کب کا ہوا مندمل مگر
اب جتنے زخم ہیں یہ ہیں سب دیکھ بھال کے

اپنوں کی بے وفائی کی تمثیل چاہیئے
دیکھیں گے آستین میں ہم سانپ پال کے

یہ جانتے ہوئے وہ علیم و خبیر ہے
ہم کیوں گناہ گار ہوئے عرضِ حال کے

جس کا کوئی شمار ہو، وہ زندگی ملے
یہ عمر تو شمار میں ہے ماہ و سال کے

صیاد اجل کا ہے اسی پَل کی تلاش میں
مسرور کیوں ہے طائرِ جاں پَر نکال کے

باتیں ہیں شوخ شوخ نگاہیں شریر ہیں
ہمسائے ہو ضرور کسی خوش جمال کے

ہوتا نہیں ہے محو کبھی دل شکن سخن
تم آئینے سے بال دکھا دو نکال کے

اس دورِ بے حسی میں تو یہ بھی ثواب ہے
احوال پوچھ لینا کسی خستہ حال کے

اک عمر ہم نے کاٹ دی فرقت کی دھوپ میں
گزرے برس فراق میں شامِ وصال کے

الزامِ ہوش بال برابر نہ لگ سکے
رکھا ہے تار تارِ گریباں سنبھال کے

ہم نے سفر حیات کا آسان کرلیا
غم ہائے دو جہاں غمِ جاناں میں ڈھال کے

حالات کے ستائے ہوئے بے زبان لوگ
خوگر نہیں درازیِ دستِ سوال کے

یہ خستہ و شکستہ دلانِ رہِ وفا
ہیں کب سے منتظر کسی پرسانِ حال کے

ساجدؔ وہ دل تھا جس نے رکھا عشق کا بھرم
تھے عقل کے تو سارے عمل اشتعال کے

☆☆☆☆☆

بستی بستی بہتا ہے
خون بھی پانی جیسا ہے

کس نے کس کو چاہا ہے
کون کسی کا ہوتا ہے

غیر ہیں اب کمیاب بہت
جس کو دیکھو اپنا ہے

خون کا رشتہ کچھ بھی نہیں
درد کا رشتہ رشتہ ہے

آؤ بنائیں وہ دیوار
جس کا سایہ ہوتا ہے

جسم تو ہیں منزل منزل
ذہنوں کا قد چھوٹا ہے

اپنی آشاؤں کے عوض
ہم نے درد خریدا ہے

ہجر کی اک شب کے آگے
عمرِ خضر اک لمحہ ہے

سایہ کیا دے گا یہ پیڑ
حد سے زیادہ اونچا ہے

پہلے صحرا تھا جیسے
دریا ایسا سوکھا ہے

☆☆☆☆☆

مشکل میں مرے کام نہ آئے مرے اپنے
گرتی ہوئی دیوار کے سائے مرے اپنے

جس سمت سے پھینکے گئے پتھر مری جانب
نکلے وہیں غیروں کے بجائے مرے اپنے

ہوں مُہر بلب کس پہ کروں خون کا دعویٰ
مقتل میں مجھے کھینچ کے لائے مرے اپنے

صد شکر کہ مرہونِ جنوں ہوکے یہ سمجھا
اپنے مرے اپنے، نہ پرائے مرے اپنے

گو ترکِ وفا جُرم ہے، ساجدؔ مرے نزدیک
لیکن مجھے دیتے ہیں یہ رائے مرے اپنے

☆☆☆☆☆

حضورِ دوست اگر باریاب ہو جائیں
تو ہم خدا کی قسم، لاجواب ہو جائیں

پھر آ گیا ہے دل اُن کی نگاہ کی زد پر
خدا کرے کہ وہ پھر کامیاب ہو جائیں

ہمارے پاس ہی ملتی ہے بس غموں کو پناہ
جو ہم نہ ہوں تو یہ خانہ خراب ہو جائیں

ہم اپنے حال کو ماضی سے جوڑتے کیوں ہیں
گزر نہ جائیں تو لمحے عذاب ہو جائیں

جنہوں نے کربِ مسرت کی دھوپ دیکھی ہے
وہ غم کی چھاؤں سے اب فیضیاب ہو جائیں

یہ خود سے پوچھیں کہ بکھرے تو کیا ملا ہم کو
جو اپنے آپ کو ہم دستیاب ہو جائیں

☆☆☆☆☆

وہ جنوں عطا ہو مجھ کو، مری آگہی کے بدلے
کہ میں غم قبول کرلوں بخوشی خوشی کے بدلے

مجھے زخم ہی ملے ہیں، میں جہاں جہاں گیا ہوں
کہیں دشمنی کے بدلے، کہیں دوستی کے بدلے

مرے دل کی سادہ لوحی کا یہ رُخ بھی تونے دیکھا
تری یاد سے لئے ہیں، تری بے رُخی کے بدلے

ملی دائمی جدائی، ہوئی غم سے آشنائی
یہ سزا گلوں نے پائی، فقط اک ہنسی کے بدلے

یہ ہماری خوش نصیبی، کہ ازل کے روز ساجدؔ
غمِ یار ہم نے پایا، غمِ زندگی کے بدلے

☆☆☆☆☆

کوئی کہہ نہیں سکتا، کس طرف، کدھر تھا وہ؟
جسم تھا نہ سایہ تھا، کچھ نہ تھا، مگر تھا وہ

وہ نظر نہ آیا تو، دور کہہ دیا اُس کو
دید تھی محال اُس کی، پاس اس قدر تھا وہ

اپنے علم کی حد پر، علم یہ ہوا ہم کو
اُس سے بے خبر تھے ہم، ہم سے باخبر تھا وہ

زہر کو دوا سمجھے، کیسے بے ہنر تھے ہم
دردِ دل دیا جس نے، کیسا چارہ گر تھا وہ

شاخ و گُل کے رشتے کا، علم ہی نہ تھا اُس کو
پھول جس نے توڑا تھا، کیا ہی کم نظر تھا وہ

خشک ہو گئیں آنکھیں، تب ہوا ہے یہ احساس
گر گیا تھا جو آنسو، نازِ چشمِ تر تھا وہ

کس سے میں گِلا کرتا، بات تھی مقدر کی
خار تھے جدھر تھا میں، پھول تھے جدھر تھا وہ

کیا ملا زمانے کو، اِس طرح جُدا کر کے
بے قرار اِدھر تھا میں، مضطرب اُدھر تھا وہ

غم میں تھی خوشی جس کی، اشک تھے ہنسی جس کی
عشق کی نگاہوں میں صرف معتبر تھا وہ

☆☆☆☆☆

بے حسی راس آ گئی ہوگی
جاگتوں کو سُلا گئی ہوگی

یاد جب اُن کی آ گئی ہوگی
سب غموں کو بھُلا گئی ہوگی

اک جھلک اُن کے روئے روشن کی
ہر نظارے پہ چھا گئی ہوگی

کون لایا ہے بوئے زلف اُن کی
کون جاتا! صبا گئی ہوگی

لب پہ پھر حرفِ مُدّعا آیا
پھر خرد ورغلا گئی ہوگی

اُن سے جب حالِ دل کہا ہوگا
جان ہونٹوں پہ آ گئی ہوگی

جان دینے کی اہلِ دل کی ادا
سب کو جینا سکھا گئی ہوگی

بے ضمیروں کے پر نکل آئے
موت نزدیک آ گئی ہوگی

کیا جوانی میں مر گیا کوئی
زندگی راس آ گئی ہوگی

راہ کتنوں کو مل گئی ساجدؔ
میری آوازِ پا گئی ہوگی

☆☆☆☆☆

خار میری کہانیوں جیسا
پھول تیری نشانیوں جیسا

قُربِ محبوب میں تو ہوتا ہے
ایک پَل زندگانیوں جیسا

ساتھ اُن کا ملے تو راہوں میں
ہر قدم کامرانیوں جیسا

میرے دل میں وہ بس گئے جب سے
میرا دل راجدھانیوں جیسا

پہلے بوڑھے جوان لگتے تھے
اب ہے بچپن، جوانیوں جیسا

عقل سے دور، کم نظر، کم علم
مگر انداز گیانیوں جیسا

اب تو یہ حال ہے کہ لگتا ہے
ظلم بھی مہربانیوں جیسا

اُن کا بخشا ہوا سکوں ساجدؔ
گہرے ساگر کے پانیوں جیسا

☆☆☆☆☆

شبِ غم کا سویرا چاہتا ہوں
مقدر کیا ہے اور کیا چاہتا ہوں

شکستِ جاں کا کچھ شکوہ نہیں ہے
شکستِ دل کا بدلا چاہتا ہوں

جو لب پر ہے وہ مجبوری ہے میری
جو دل میں ہے وہ کہنا چاہتا ہوں

نہ ہو پوری اُمیدِ وصل یارب!
میں جینے کا بہانہ چاہتا ہوں

جو ساری خواہشوں کو ختم کردے
میں اُس خواہش پہ مرنا چاہتا ہوں

مری اپنی کوئی مرضی نہیں ہے
ترا ہوں، تیرا چاہا چاہتا ہوں

نہ ہو جس میں کوئی ہنگامۂ خواب
میں ایسی نیند سونا چاہتا ہوں

ترے طرزِ تغافل کی بدولت
تڑپنے کا سلیقہ چاہتا ہوں

کتابی علم ناکافی ہے ساجدؔ
میں اب چہروں کو پڑھنا چاہتا ہوں

☆☆☆☆☆

نگہہِ رحمتِ حق یوں جو خفا ہم سے ہوئی
کچھ نہ کچھ، کوئی نہ کوئی، تو خطا ہم سے ہوئی

صرف اخلاق کی قدروں کی یہ نا قدری ہے
اتنی برگشتہ جو تاثیرِ دعا ہم سے ہوئی

کوچۂ یار کی خوشبو سے ہوئے ہم محروم
کون سی ایسی خطا بادِ صبا ہم سے ہوئی؟

لب پہ بے مہریِ محبوب کا شِکوہ آیا
جانتے بوجھتے توہینِ وفا ہم سے ہوئی

نذرِ محبوب کئے جان و جگر، قلب و نظر
شکر ہے عشق کی اک رسم ادا ہم سے ہوئی

گردشِ وقت نے حالات بنائے ایسے
نہ وفا تم سے ہوئی، اور نہ وفا ہم سے ہوئی

اپنے عرفان سے عرفانِ خدا بھی ہوتا
خود کو سمجھے نہیں، تکفیر انا ہم سے ہوئی

جب سے جانا ہے کہ ہے دردِ دل اُن کی سوغات
نہ دعا ہم سے ہوئی اور نہ دوا ہم سے ہوئی

زندگی کے لئے ساجدؔ کوئی احساں نہ لیا
اب کے شرمندہ بہت موجِ بلا ہم سے ہوئی

☆☆☆☆☆

ظلم کی رد میں جو مصروفِ بیاں ملتے ہیں
کچھ دنوں بعد وہ محرومِ زباں ملتے ہیں

لوگ شائستۂ احساس کہاں ملتے ہیں
اب کتابوں میں ہی کچھ اُن کے نشاں ملتے ہیں

ایک سے ہو گئے سب لوگ بفیضِ افلاس
اب تو اپنے بھی بشکلِ دگراں ملتے ہیں

وار ہوتے ہیں زباں کے، کہیں چہروں سے عیاں
شیشۂ دل پہ کھروچوں کے نشاں ملتے ہیں

لوگ کہتے ہیں مناظر ہیں نگاہوں کا فریب
مجھ کو منظر دل و جاں کے نِگراں ملتے ہیں

کم نظر مسندِ ارشاد پہ آتے ہیں نظر
ہاتھ ملتے ہوئے صاحب نظراں ملتے ہیں

اک زمانہ تھا، اُخوت تھی جزائے ہجرت
اب مہاجر ہدفِ تیر و سناں ملتے ہیں

اہل دل کو ازلی ربط ہے غم سے ساجدؔ
غم وہیں ملتے ہیں یہ لوگ جہاں ملتے ہیں

☆☆☆☆☆

قدریں بدل گئی ہیں، تقاضے بدل گئے
وہ دور ہے کہ خون کے رشتے بدل گئے

نظریں بدل گئیں، نہ نظارے بدل گئے
اتنا ہے بس کے ذہن کے دھارے بدل گئے

اتنا تو کچھ طویل نہ تھا، عرصۂ قفس
چھوٹے جو ہم قفس سے تو نقشے بدل گئے

شہرِ جنوں میں ہوتے تھے، بیگانے آشنا
شہرِ خرد میں آئے تو اپنے بدل گئے

جب بھی بڑھے ہیں اہلِ وفا، شمعِ جاں لئے
ہر بار آندھیوں کے ارادے بدل گئے

روزِ ازل سے قصرِ تمنا میں ہوں اسیر
یہ بھی خبر نہیں کہ زمانے بدل گئے

ہم خود کو کر ہی پائے تھے شائستۂ حیات
اتنے میں زندگی کے تقاضے بدل گئے

ہم بھی کبھی تھے اُن کی نگاہوں کا اعتبار
وہ دن گزر گئے، وہ زمانے بدل گئے

ہم کو بڑا یقین تھا جن کے ثبات پر
وہ درد مند وقت سے پہلے بدل گئے

ساجدؔ نصیب میں ہی نہیں شاید اُن کا ساتھ
دوگام ہی چلے تھے کہ رستے بدل گئے

☆☆☆☆☆

گر خوشی ہے تو عارضی کیوں ہے؟
اور غم ہے تو دائمی کیوں ہے؟

غم ہے جب زینتِ جہانِ خیال
غم نہ ہونے کی پھر خوشی کیوں ہے؟

دعویِ برتری ہے جب تم کو
پھر یہ احساس کمتری کیوں ہے؟

یوں تو اک عمر کا ہے ساتھ اپنا
زندگی پھر بھی اجنبی کیوں ہے؟

ساری آسائشیں مہیا ہیں
پھر پریشان آدمی کیوں ہے؟

میں تو ہوں ہی مزاج آوارہ
تیری صورت میں دلکشی کیوں ہے؟

حوصلہ ہو تو اپنے آپ ہنسو
لب پہ مانگی ہوئی ہنسی کیوں ہے؟

مطمئن کارگاہِ ہستی میں
میں نہیں ہوں تو کوئی بھی کیوں ہے؟

کٹنے والے ہیں جو بطورِ سزا
ایسے ہاتھوں میں رہبری کیوں ہے؟

کیا اسے انقلاب کہتے ہیں
بے گناہی گناہ سی کیوں ہے؟

اک نیا زخم روز کھاتے ہو
ساری دنیا سے دوستی کیوں ہے؟

سب کو ہمدرد کیوں سمجھتے ہو
تم میں اس درجہ سادگی کیوں ہے؟

ساجدؔ ایماں ہے جب ترا تسلیم
تیرا لہجہ شکایتی کیوں ہے؟

☆☆☆☆☆

اُمیدوں، آرزوؤں، حسرتوں کے گھر میں رہا
میں ساری عمر، گلستانِ بے شجر میں رہا

یہ اور بات کہ قاتل پہ حرف آ نہ سکا
ہمارے قتل کا چرچا تو شہر بھر میں رہا

گرے جو آنکھ سے مٹی میں مل گئے وہ اشک
گُہر تھا بس وہی آنسو، جو چشمِ تر میں رہا

ان آندھیوں میں بھلا بے گھروں کی بات ہی کیا
جو اپنے گھر میں تھا وہ بھی کب اپنے گھر میں رہا

ہم آشنا نہ وطن سے ہوئے، نہ ہجرت سے
ہمارا گھر بھی، ہماری طرح سفر میں رہا

رہا میں اُن کے حصارِ نگاہ میں ساجدؔ
کبھی نظر سے گِرا اور کبھی نظر میں رہا

غم ہے اس دل کو سازگار بہت
بے قراری میں ہے قرار بہت

اپنی زلفوں کو مت سنوار بہت
دامن دل ہے تار تار بہت

گلستانِ حیات کیسا ہے
گُل بہت کم ہیں اور خار بہت

موت کو کیسے جھیل پاؤ گے
تم کو ہے زندگی سے پیار بہت

بہہ گیا آنسوؤں میں وعدۂ صبر
آنکھ ہے دل سے شرمسار بہت

وقت تم پر ابھی پڑا ہی نہیں
دوستوں پر ہے اعتبار بہت

زندگانی گزارنے کے لئے
حسرتِ دیدِ روئے یار بہت

ساری قدریں بدل گئیں ساجدؔ
مطمئن ہے گناہ گار بہت

☆☆☆☆☆

یہ فلسفۂ ہستی تنہا کوئی کب جانا
کچھ میں تمہیں سمجھاؤں، کچھ تم مجھے سمجھانا

کوسیں گے قیامت تک جام و مے و میخانہ
رندو! کہیں واعظ کی باتوں میں نہ آجانا

اِس قیدِ عناصر سے، چھٹنا تو یقینی ہے
ہے موت حقیقت میں، احساس کا مرجانا

عشق اور زمانے کا جھگڑا ہے زمانے سے
دل عقل سے کہتا ہے تو بیچ میں مت آنا

دیوانے کو ہی دنیا، دیوانہ سمجھتی ہے
دیوانہ سمجھتا ہے ہر ایک کو دیوانا

اُس پر مفتوں جادو بھی
رستہ دیکھے خوشبو بھی

دن میں اُن آنکھوں کی چمک
حیرت میں ہے جگنو بھی

درد اُسی پہلو سے اُٹھے
میں بیٹھوں جس پہلو بھی

صبح نہ دیکھی پروانے
مجھ جیسا نکلا تو بھی

تم نے اب ہنسنے کو کہا
خشک ہوئے جب آنسو بھی

اپنے ہی قد سے بہر زاویہ اونچا ہو جاؤں
میں اگر ایک بھی مفلس کا سہارا ہو جاؤں

اب تو ہر راہ میں عریانی ہی عریانی ہے
عافیت اب ہے اسی میں کہ میں اندھا ہو جاؤں

درد، غم، شدّتِ احساس سے ہے میری شناخت
اپنی پہچان گنوادوں تو اکیلا ہو جاؤں

لب پہ بھولے سے بھی گر رازِ محبت آجائے
اُن کی رُسوائی بھی ہو، میں بھی تماشا ہو جاؤں

عشق کا نام رہے مجھ پہ وفا ناز کرے
جس کا اک بار میں ہو جاؤں، اُسی کا ہو جاؤں

میں ہوں اک موج، جو اُٹھوں تو اُٹھادوں طوفاں
اور معدوم جو ہو جاؤں تو دریا ہو جاؤں

اگلی نسلوں کے حوالے مجھے کچھ کرنا ہے
اس سے پہلے کہ میں ماضی کا حوالہ ہو جاؤں

شوق کے دوش پہ میں سیرِ فلک کر آیا
اب یہ حسرت ہے ترا نقشِ کفِ پا ہو جاؤں

دھوپ میں گھر سے میں نکلا تو ہوں ساجدؔ لیکن
کہیں ایسا نہ ہو سورج کا نوالا ہو جاؤں

☆☆☆☆☆

جلوۂ یار بھی تماشہ ہے
جس نے دیکھا ہے، اس نے دیکھا ہے

آج دنیا میں جھوٹ اتنا ہے
صرف سچ بولنا بھی تقویٰ ہے

ایک پل بھی اِسے ثبات نہیں
غم خوشی کی ہنسی اُڑاتا ہے

ہے کسی مردِ حق کا نقشِ قدم
یہ دیا راہ میں جو رکھا ہے

بے سبب حادثہ نہیں ہوتا
زندگی موت کا بہانہ ہے

موت کی گتھیاں نہ سُلجھاؤ
زندگی بھی تو اک معما ہے

مرنے والوں کے نقشِ پا سے ہمیں
زندگی کا سُراغ ملتا ہے

کہیں رُکتا ہے جذبۂ صادق
یہ دیا آندھیوں میں جلتا ہے

اُن کو دیکھا ہے ہم نے جی بھر کے
آج ہم نے پہاڑ کاٹا ہے

مجھ کو تسلیم کب ہے اپنا وجود
آئنہ کا بیان جھوٹا ہے

آج ساجدؔ ہر ایک شے ہے گراں
صرف انساں کا خون سستا ہے

☆☆☆☆☆

تیر کھائے ہیں روز و شب کتنے
زخم پائے ہیں بے سبب کتنے

رہ گئی آب اُن کے دامن کی
میرے آنسو ہیں با ادب کتنے

یاد یہ بھی نہیں ہنسے کب تھے
امتحاں اور میرے رب کتنے

آج اس دورِ بے حیائی میں
مُستند رہ گئے نسب کتنے

عزّتِ نفس کی بقا کے لئے
ہم نے ٹھکرائے ہیں لقب کتنے

یوں ہے سُنسان آج منزلِ دار
سر پھرے رہ گئے ہیں اب کتنے

مُنھ پہ تعریف، نرم گوئی، تپاک
دشمنی کے ہیں اور ڈھب کتنے

اُن کی وقعت ہے جو تھے بے اوقات
وقت نے ڈھائے ہیں غضب کتنے

مطمئن مُشکلات راہ سے ہیں
رہ روانِ رہِ طلب کتنے

ساجدؔ اعضا ہی جب بنیں گے گواہ
آپ محجوب ہوں گے تب کتنے

☆☆☆☆☆

اُس کو کسی صورت سے ممکن سمجھانا کب ہے
دیوانہ خود اپنی نظر میں دیوانہ کب ہے

دامِ ہَوس بڑھتا رہتا ہے، تنگ نہیں ہوتا
مرتے دم تک کاسۂ حسرت بھر جانا کب ہے

ڈور ہے جس کے ہاتھ میں سب ہے اُس کی مرضی پر
گتھی کو اُلجھانا کب ہے، سُلجھانا کب ہے

اُس کو اُجرت لینی ہے بس اپنی خطابت کی
واعظ کا مقصد لوگوں کو سمجھانا کب ہے

خوشبو موسم، دھنک فضا، فردوس گلی کوچے
اُس بستی میں اب اپنا آنا جانا کب ہے

اپنا غم، غم ہائے زمانہ، اُمیدوں کی بھیڑ
قریۂ دل میں آبادی ہے ویرانہ کب ہے

محفل میں کیوں جائے جس کو یہ بھی نہ ہو معلوم
کب تک رُکنا ہے محفل میں اُٹھ جانا کب ہے

ایسے جینا ہے خود موت آتی ہوئی کترائے
دیوانو! معیارِ محبت مرجانا کب ہے

جو تم ساجدؔ نذر کروگے وہ حق ہے اُن کا
مجبوروں کی خدمت کرنا جرمانہ کب ہے

☆☆☆☆☆

اپنی جبینِ شوق کو سستا مت کر لینا
ایسے ویسے در پر سجدہ مت کر لینا

ساتھی ڈھونڈو اور پھر ساتھ نبھانا سیکھو
اس دنیا میں خود کو اکیلا مت کر لینا

ناداری آتی ہے اور چلی جاتی ہے
پُرکھوں کی دستار کا سودا مت کر لینا

مصلحتاً کچھ سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں
ہر اک سے لڑنے کا ارادہ مت کر لینا

غیر تو ہیں پھر غیر بھلا کیا آشا اُن سے
کم سے کم اپنوں کو پرایا مت کر لینا

جھوٹوں کے سر کی دستار ضرور اُچھالو
پہلے مگر اونچی اپنی قامت کر لینا

سچی سحر لانے کا وعدہ کر لیتی ہے
تم اِس جھوٹی شب پہ بھروسہ مت کر لینا

سارے مسائل حال کے اُلجھے رہ جائیں گے
ماضی کے زخموں کو تازہ مت کر لینا

لمحاتی عزت، سستی شہرت کے لئے
اپنی شخصیّت کو دُہرا مت کر لینا

پہنچ نہ پائیں ہاتھ سروں تک مجبوروں کے
اپنے قد کو اتنا اونچا مت کر لینا

دشمن کا تو وار اوچھا بھی ہو سکتا ہے
اپنوں سے خود کو بے پروا مت کر لینا

اُمیدیں ٹوٹیں تو بکھر جاؤ گے ساجدؔ
تم امیدیں حد سے زیادہ مت کر لینا

☆☆☆☆☆

مری جبیں کو نصیب جب اُن کا آستاں تھا
زمین میری تھی اور میرا ہی آسماں تھا

ہر ایک جانب تھا ذرّہ ذرّہ سے وہ عیاں تھا
وہ ایک تھا صرف ایک تھا اور کہاں کہاں تھا

سُنی رگِ جاں کے پاس قدموں کی چاپ میں نے
بہت زمانوں سے بے صدا میرا شہرِ جاں تھا

جہاں سے رُخصت ہوئے فرشتہ نژاد انساں
زمیں نہ تھی ایک آسماں زیرِ آسماں تھا

ابھی ابھی جو لُٹا سرِ راہِ نا اُمیدی
مری تمناؤں، حسرتوں کا وہ کارواں تھا

ہوں اس لئے چپ کہ مجھ کو کہنا ابھی بہت ہے
زبان جس کی کٹی ہے وہ میرا ہم زباں تھا

وہ میرے اندر سے ہو کے گزرے سُنا ہے میں نے
پتہ نہیں مجھ کو جانے اُس وقت میں کہاں تھا

وہ اہلِ گُلشن سے کیسے عہدِ وفا نبھاتا
بُریدہ پر تھا قفس نُما جس کا آشیاں تھا

اسی نے دی تھی مجھے فرازِ جُنوں کی مَسند
خرد کا احسان مند میرا رُواں رُواں تھا

☆☆☆☆☆

دیدارِ یار کا ہُنر آتا نہیں مجھے
خوشبو کی طرح وہ نظر آتا نہیں مجھے

ذہن و دل و نگاہ جو ہوتے ہیں محوِ یار
اپنا خیال لمحہ بھر آتا نہیں مجھے

جس سمت لوگ دوڑ رہے ہیں بشوقِ دید
کچھ بھی نظر مگر اُدھر آتا نہیں مجھے

کیسے کروں میں اپنے گنہ پر اُمیدِ عفو
رونا بہ ساعتِ سحر آتا نہیں مجھے

آتا نہیں کسی کی مسرّت پہ اعتبار
ہنسنا کسی کی بات پر آتا نہیں مجھے

تسخیرِ کائنات کی ہمت تو مجھ میں ہے
تقدیر سے مگر مَفَر آتا نہیں مجھے

حدِ نظر کے پار ہے اُن کی حریمِ ناز
اُڑنا تو چاہتا ہوں پر آتا نہیں مجھے

ساجدؔ مرا وجود ہی حائل ہے بالیقیں
ہو کر مجھی میں وہ نظر آتا نہیں مجھے

☆☆☆☆☆

اشکِ ندامت میں ہے خوفِ خدا کی دلیل
آہِ سحرگاہ ہے عفوِ خطا کی دلیل

یہ ترا حُسنِ بقا، تیری عطا کی دلیل
یہ مرا ذوقِ وفا، میری انا کی دلیل

یوں تو ہر اک زندگی، اپنی فنا کی دلیل
مردِ مجاہد کی موت اُس کی بقا کی دلیل

قوتِ ہر ذرّہ ہے طاقتِ حق کا ثبوت
منظرِ قوسِ قزح نورِ خدا کی دلیل

مرکزِ ہر دائرہ نقطۂ بے طول و عرض
سنگ کے کیڑے کو رزق، ربِّ عُلا کی دلیل

فلسفۂ عقل و فہم، آج تلک بے اساس
عشق کا ذوقِ جُنوں اپنی بقا کی دلیل

پائیں گے اہلِ زباں، میرا یہ دعویٰ درست
ہوتی ہے ہر خامشی صوت و صدا کی دلیل

ساجدؔ کم علم و فہم کیسے کہے وہ غزل
جس کا ہر اک شعر ہو طبع رسا کی دلیل

☆☆☆☆☆

مئے الست سے لبریز جام چاہتے ہیں
دوائے دردِ دلِ تشنہ کام چاہتے ہیں

عجیب دور ہے بد کوش نام چاہتے ہیں
شکست خوردہ بھی اب احترام چاہتے ہیں

ہمیں نے جن کے سروں پر سجائی تھی دستار
وہ لوگ آج ہمیں سے سلام چاہتے ہیں

زمین دوز تخیل، دماغ ٹخنوں میں
یہ پستہ قد بھی تو اعلیٰ مقام چاہتے ہیں

ہمارے عہد کے یہ ننگِ قوم اپنے سِوا
ہر ایک شخص کو بے ننگ و نام چاہتے ہیں

حسد دلوں میں بھرا ہے تو بغض ذہنوں میں
اور اس پہ آپ سکونِ مدام چاہتے ہیں

ہجومِ راہِ عدم دیکھنے کے بعد بھی لوگ
فنا پذیر جہاں میں دوام چاہتے ہیں

بروئے کار جو آجائے ہر بدی کے خلاف
ہر ایسی تیغ کو ہم بے نیام چاہتے ہیں

نہ اِن میں ضبط کی خوبی، نہ اِن میں حُسنِ وفا
تری جفاؤں کا جو انتقام چاہتے ہیں

وہ جیسے لائی تھی اک بار بوئے زُلف اُن کی
صبا سے پھر وہی طرزِ خرام چاہتے ہیں

بطورِ مہرِ تمنّا بشکلِ صبحِ اُمید
بس اک جھلک تری ماہِ تمام چاہتے ہیں

خدا سے اپنے فقط نفسِ مطمئن چاہو
یہ مال و زر تو سبھی خاص و عام چاہتے ہیں

تمہارے قول سے ساجدؔ کسی کا دل نہ دُکھے
یہ گونگے لفظ بھی حُسنِ کلام چاہتے ہیں

☆☆☆☆☆

کوئی زمانے کی پروا نہ کچھ اَنا کا خیال
خیالِ یار بھی ساجدؔ ہے کس بلا کا خیال

کسی سے ٹوٹ کے کوئی بھی دوستی نہ کرے
جو ابتدا ہی میں آجائے انتہا کا خیال

پڑا جو وقت تو کرنے لگے دُعائے عریض
نشاط و عیش میں آتا نہیں خدا کا خیال

نِگل ہی جائے یہ صحرائے تشنگی مجھ کو
اگر نہ آئے کہیں دشتِ کربلا کا خیال

مریضِ عشق کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے
نہ کوئی فکرِ اِفاقہ نہ کچھ دوا کا خیال

بس آن کر ہی مجھے دیکھ لیتے برسرِ دار
تمہیں اک آن نہ آیا مری وفا کا خیال

گِلہ نہ ہوتا مقدّر کی نا رسائی کا
جو ہوتا اُن کو مرے بختِ نا رَسا کا خیال

گُنہ سے توبہ مگر اُس کے بعد اعادۂ جُرم
یہ کیسے عام ہوا جُرمِ ناسزا کا خیال

جہاں میں کوئی اگر درد آشنا ہوتا
تبھی تو آتا کسی درد آشنا کا خیال

طبیب بھی تو دُعاؤں میں ہوگیا مصروف
وہ حال تھا کہ نہ آیا اُسے دوا کا خیال

ہے ساجدؔ اِس پہ ہی دنیا و آخرت کا مدار
ہر اک قدم پہ ہو اللہ کی رضا کا خیال

☆☆☆☆☆

کوئی کیا کرے یہ تو اپنا اپنا نصیب ہے
درِ یار سے کوئی دور، کوئی قریب ہے

یہ حیات ہم نے حُصولِ علم میں کاٹ دی
مگر آگہی تو سکونِ دل کی رقیب ہے

جنہیں رازِ عشقِ وفا کا علم ہوا اُنہیں
غمِ جان و دل سے عزیز یادِ حبیب ہے

کسی دل شکستہ اَلَم رسیدہ کے واسطے
یہ نویدِ صبح تو شامِ غم کی نقیب ہے

میں تری امارتِ حُسن کیسے بیاں کروں
مری دسترس کا ہر ایک لفظ غریب ہے

کبھی کرب میں اُسے عافیت کبھی درد میں
یہ سکونِ دل کا معاملہ بھی عجیب ہے

کوئی مُشترک نہیں وصف پھر بھی جُدا نہیں
یہ خوشی و غم کا تضاد کتنا عجیب ہے

نہ کسی کی فکرِ نہ دُکھ کوئی، نہ کسی کا غم
جسے ہم امیر سمجھ رہے ہیں غریب ہے

مجھے ہو نہ پائے گا فہم اُسکے وجود کا
کہ مری نگاہ سے اِس قدر وہ قریب ہے

ہے ہر ایک ذرہ حریفِ آئینہ اِس جگہ
یہ دیارِ غیر نہیں دیارِ حبیب ہے

☆☆☆☆☆

یہ تو مجھے یقین ہے، سب سے تو وہ چھپا نہیں
جن کو پتہ ہے یار کا، اُن کا کوئی پتہ نہیں

ہے جسے اُس کی معرفت، اُس کا وجود آئینہ
آئینہ دیکھتا تو ہے، آئینہ بولتا نہیں

جلوۂ حُسنِ یار کی، تاب کہاں سے لاؤں گا
حسرتِ دید کیا کروں، دید کا حوصلہ نہیں

ختم تو ہو تنازعہ، فرض کریں ہم اور تم
تم نے بھی کچھ کہا نہیں، ہم نے بھی کچھ سُنا نہیں

میں اُسے یاد ہی نہیں، اُس نے مجھے بُھلا دیا
عقل کے اس خیال کو، دل ہے کہ مانتا نہیں

عشق کا یہ دیار ہے، جو بھی ہے بے قرار ہے
حدِ نِگاہ تک یہاں، کوئی غم آشنا نہیں

رہبرِ عہدِ نو ہمیں، لے کے چلا تھا جس طرف
بعد میں یہ پتہ چلا، یہ تو وہ راستہ نہیں

کچھ مرے آہ و نالہ سے، اُن کی نہیں مماثلت
آہ جو بے اثر نہیں، نالہ جو نا رَسا نہیں

بُجھ گئے آس کے دیئے، ختم ہوئے سب آسرے
گردشِ وقت اب تلک، کیا ترا دل بھرا نہیں

پاؤں پہ لوٹنا تھا بس، خاک کو چومنا تھا بس
میری نگاہِ شوق کو، پاسِ ادب ذرا نہیں

لوحِ خیال پر ہے نقش، بے خد و خال ایک شکل
حدِ بیاں سے پار ہے، فہم سے ماورا نہیں

زخمِ جگر وہ زخم ہے، جو نہیں مرہم آشنا
دردِ جگر وہ درد ہے، جس کی کوئی دوا نہیں

خونِ جگر کی آنچ نے، بخشی ہو جس کو روشنی
جو یہ دِیا بُجھا سکے ایسی کوئی ہوا نہیں

ساجدؔ خستہ گھر گیا، جب کہ اُسے یہ علم تھا
عشق کی ابتدا تو ہے، عشق کی انتہا نہیں

☆☆☆☆☆

عقل کی دوڑ دھوپ کا سارا صلہ کچھ اور ہے
جس کی مجھے تلاش ہے اُس کا پتہ کچھ اور ہے

چھوڑ دے اب تو چارہ گر، بس مجھے میرے حال پر
میرا مرض کچھ اور ہے، تیری دوا کچھ اور ہے

قیدِ ستم میں جی لئے، ظلم پہ ہونٹ سی لئے
آج مگر ارادۂ اہلِ وفا کچھ اور ہے

سنگ کا سنگ سے جواب، دے دیا ہوگیا حساب
صبر کا پھل کچھ اور ہے، اُس کا مزا کچھ اور ہے

ہے درِ توبہ وا ابھی، کاش وہ سوچتا کبھی
جسکا عمل کچھ اور ہے، حکمِ خدا کچھ اور ہے

موت و حیات ہی فقط، مقصدِ زندگی نہیں
سرِّ بقا کچھ اور ہے، رازِ فنا کچھ اور ہے

☆☆☆☆☆

مجھے تو اُس سے اُمیدِ وفا ذرا بھی نہیں
وہ درد مند تو کیا، درد آشنا بھی نہیں

گنوا چُکا ہوں تشخّص میں اپنا اِس حد تک
کہ میری سمت کوئی مُڑ کے دیکھتا بھی نہیں

مکان اُس کا ہے دشتِ حیات کے اُس پار
یہ فاصلہ تو کوئی ایسا فاصلہ بھی نہیں

میں راہِ عشق میں اب اُس مقام پر ہوں جہاں
کوئی نہیں ہے، کسی کے نقوشِ پا بھی نہیں

نہ جانے کس لئے مایوس ہیں مرے ہمدرد
دوا اگر نہیں کوئی تو کیا دُعا بھی نہیں

جہاں غریب کی تحقیر ہو امیر کی قدر
تمام عمر اُدھر مُڑ کے دیکھنا بھی نہیں

پڑا جو وقت تو اپنے بھی ساتھ چھوڑ گئے
یہ حال ہے کہ کوئی حال پوچھتا بھی نہیں

کہیں یہ اذنِ حضوری نہ رائیگاں ہو جائے
یہاں تو جُرأتِ اظہارِ مُدّعا بھی نہیں

رہِ وفا سے کچھ اِس درجہ لوگ خائف ہیں
ہمارے ساتھ کوئی دو قدم چلا بھی نہیں

لگائے بیٹھے تھے ہم شام سے سحر کی اُمید
پر اس سحر میں اُجالوں کا شائبہ بھی نہیں

☆☆☆☆☆

اپنی پہچان گنوانے کا ہُنر کیوں چاہوں
بے گھری کی میں علامت ہوں تو گھر کیوں چاہوں

کرب جب گوندھا گیا ہے مرے آب و گِل میں
پھر میں آلام و مصیبت سے مفر کیوں چاہوں

تیری مرضی کو سدا میں نے مقدّم رکھا
تو نہ چاہے تو شبِ غم کی سحر کیوں چاہوں

رحمتِ حق کا سمندر ہے ترا ہر قطرہ
خُشک ہونا ترا اے دیدۂ تر کیوں چاہوں

غم تو دامن کو جواہر سے بھرا رکھتا ہے
کچھ نہ ہاتھ آئے تو ہنسنے کا ہُنر کیوں چاہوں

چاہنا چاہیئے اس دور میں جو سب چاہیں
میں ہر اک بات بہ اندازِ دِگر کیوں چاہوں

جب میں شائستۂ افعال نہیں ہوں ساجدؔ
مانگوں کس مُنہ سے، دعاؤں میں اثر کیوں چاہوں

یاد اُن کی اگر نہ آئے تو!
کیا کرے گا یہ دل بتائے تو!

قصۂ غم پہ اُن کی آنکھوں میں
کچھ ستارے سے جھلملائے تو

دل میں ہیں کچھ سوال نا گفتہ
کوئی اُن کا جواب لائے تو!

جو ابھی ناشناسِ منزل ہے
دو قدم میرے ساتھ آئے تو

ہے مُصِر میرا بار اُٹھانے پر
وہ ابھی اپنا بار اُٹھائے تو

انتظارِ سَحر سے چھوٹونگا
اپنا وعدہ قضا نبھائے تو

یاد اُن کی اگر نہ آئے تو!
کیا کرے گا یہ دل بتائے تو!

قصۂ غم پہ اُن کی آنکھوں میں
کچھ ستارے سے جھلملائے تو

دل میں ہیں کچھ سوال نا گفتہ
کوئی اُن کا جواب لائے تو!

جو ابھی ناشناسِ منزل ہے
دو قدم میرے ساتھ آئے تو

ہے مُصِر میرا بار اُٹھانے پر
وہ ابھی اپنا بار اُٹھائے تو

انتظارِ سَحر سے چھوٹونگا
اپنا وعدہ قضا نبھائے تو

سب کا غم ایک سا نہیں ہوتا
تم کو ہنسنا نہ راس آئے تو!

جس کو منزل کا ہے پتہ معلوم
تھک کے رستے میں بیٹھ جائے تو!

تم جو سچ بولنے کے عادی ہو
جھوٹ کا بوجھ سہہ نہ پائے تو!

غم کا مارا ہوں پھر بھی ہنس دوں گا
کوئی ہنسنا مجھے سِکھائے تو!

میں جسے یاد ہی نہیں کرتا
وہ اگر مجھ کو بھول جائے تو!

ذرّۂ خاکِ پا یہ کہتا ہے
مجھ سے سورج نظر ملائے تو

تم کو ہے زندگی سے پیار بہت
زندگی تم سے روٹھ جائے تو!

رازِ ہستی سمجھ سکوں شاید
بے خودی خود خودی سکھائے تو

شعر ساجدؔ کہے گا کار آمد
اپنا خونِ جگر بہائے تو

☆☆☆☆☆

ابتدائی غزلیں

(زندگی کے سب سے پہلے چار شعر)

یہ مری زیست کا ساماں تو نہیں
غمِ دنیا، غمِ جاناں تو نہیں

میرے دل میں ہے متاعِ غمِ عشق
میں کوئی بے سر و ساماں تو نہیں

آج کیوں بزمِ جہاں ہے برہم
آپ کی زلف پریشاں تو نہیں

آپ کا وعدۂ فردا تو بجا
لیکن اس بات کا امکاں تو نہیں

☆☆☆☆☆

کہیں یہ بات اک عالم نہ کہہ دے
مرے غم کو تمہارا غم نہ کہہ دے

چھپا رکھا ہے جو مدّت سے دل میں
کہیں وہ راز چشمِ نم نہ کہہ دے

محبت میں تری گُل بھی ہیں گریاں
ان اشکوں کو کوئی شبنم نہ کہہ دے

کوئی اِس گردشِ دوراں کو اے دوست!
تری زلفوں کے پیچ و خم نہ کہہ دے

کوئی تشنہ لبی پر اپنی ساقی
تری دریا دلی کو کم نہ کہہ دے

☆☆☆☆☆

دونوں جہاں میں کچھ بھی اگر چاہیئے مجھے
بس آپ کی کرم کی نظر چاہیئے مجھے

مثلِ کلیم ہوش نہ اُڑ جائیں اے خدا!
جلوہ بقدرِ ظرف نظر چاہیئے مجھے

اُکتا گیا ہوں چل کے زمانے کے ساتھ ساتھ
اب اور کوئی راہ گُزر چاہیئے مجھے

وہ دن گئے کہ تھی مجھے اُن کی ہی جستجو
اب تو یہ ہے کہ اپنی خبر چاہیئے مجھے

ہے اُن کے زُلف و رُخ سے نگاہوں کو واسطہ
اب کیا رِدائے شام و سَحر چاہیئے مجھے

آرائشِ جُنوں کے لئے غم کے ساتھ ساتھ
پلکوں پہ اُن کی ایک گُہر چاہیئے مجھے

وہ در تو کوئی در نہیں جس پر نہ سر جھکے
سر اُٹھ سکے نہ جس سے وہ در چاہیئے مجھے

ساجدؔ ہیں دل میں وقتِ اجل حسرتوں کے داغ
کیا اور کوئی زادِ سفر چاہیئے مجھے

☆☆☆☆☆

نہ کھائی چوٹ غمِ روزگار سے میں نے
سکون پا ہی لیا ذکرِ یار سے میں نے

لیا یہ کام، دلِ بے قرار سے میں نے
بدل دیا تری نفرت کو پیار سے میں نے

بہار میں کوئی پابندیِ فُغاں تو نہیں
یہ پہلے پوچھ لیا ہے بہار سے میں نے

مرا فسانۂ ہستی ہے یک نفس اے دوست!
یہ بات کہتے سُنا، گُل کو خار سے میں نے

سُبک خرامیِ محبوب کی حریف نہ بن
یہ کہہ دیا ہے نسیمِ بہار سے میں نے

بس ایک گُل کے لئے گلستاں میں اے بُلبُل!
کیا ہے ترکِ تعلق ہزار سے میں نے

بیانِ قصۂ غم کو زباں کی کیا حاجت
زباں کا کام لیا چشمِ زار سے میں نے

ہر نظر طالبِ دیدار کہاں تھی پہلے
زندگی درد سے دوچار کہاں تھی پہلے

دیکھ آئی ہے صبا اُن کو کہیں محوِ خرام
اس میں یہ شوخیِ رفتار کہاں تھی پہلے

اُن کی زُلفوں نے مرے دل سے کیا ساز ضرور
میری دنیا میں شبِ تار کہاں تھی پہلے

ہے یہ انجام مرے قصۂ غم کا شاید
احتیاجِ رسن و دار کہاں تھی پہلے

اُن کی مژگاں پہ لرزتے تھے ستاروں کے ہجوم
راہِ غم سہل تھی، دشوار کہاں تھی پہلے

اب جُنوں کی کوئی منزل نہیں باقی شاید
لذّتِ غم طرب آثار کہاں تھی پہلے

مجھ کو دیکھیں نہ مری راہِ گزر کو دیکھیں
آپ تو صرف مرے ذوقِ نظر کو دیکھیں

آگ اوروں کے گھروں کی جنہیں تڑپاتی ہے
ملتمس ہوں وہ ذرا اپنے بھی گھر کو دیکھیں

اک سمندر ہے بنا سوئی ہوئی نیندوں کا
غور سے آپ مرے دیدۂ تر کو دیکھیں

یہ تو مانا کہ ہے غم، کربِ مسرّت کا علاج
غم جنہیں راس نہ آئے وہ کِدھر کو دیکھیں

جنکو شائستۂ کردار کہا جاتا ہے
آیئے اُن کی دعاؤں کے اثر کو دیکھیں

پیڑ بے سایہ تو، گھر بے در و دیوار یہاں
بستیاں دیکھ لیں، اب آؤ کھنڈر کو دیکھیں

اگر وہ مُسکرا دیں اپنے جی سے
چمن میں ہاتھ اُٹھالیں گُل ہنسی سے

وہی اک جامِ رنگیں اور ساقی
ابھی وابستگی ہے تشنگی سے

تمہاری زُلف اُلجھائی ہمیں نے
بنے دیوانے ہم اپنی خوشی سے

عنایت گردشِ دوراں کی ہے یہ
مجھے نفرت نہیں ہے زندگی سے

یہ ساغر کیا تری نظریں بھی ساقی
ہیں شرمندہ ہماری تشنگی سے

کسی کو کیوں ہنسائیں اپنے اوپر
کہیں کیوں حال ہم اپنا کسی سے

یہ عالم ہے مری مایوسیوں کا
گزرتی ہے قضا بھی بے رُخی سے

یقیناً جوش میں آئیگی یارب!
تری رحمت مری تر دامنی سے

☆☆☆☆☆

غم سے خوش کوئی دکھائی نہیں دیتا یارو!
غم مگر داغِ جُدائی نہیں دیتا یارو!

شمعِ احساس بُجھی ہے تو اندھیرا ہے بہت
ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہیں دیتا یارو!

روز کچھ چیخیں فضاؤں میں بکھر جاتی ہیں
اور دنیا کو سُنائی نہیں دیتا یارو!

بے سہاروں کی حمایت پہ جو اڑ جاتا تھا
آج وہ شخص دِکھائی نہیں دیتا یارو!

تجربے تلخ ہوئے سب کو، کچھ اس درجہ کہ اب
کوئی اپنوں کی دُہائی نہیں دیتا یارو!

آج کے دور میں غیروں کی شکایت کیا ہو
ساتھ اب بھائی کا بھائی نہیں دیتا یارو!

شعر کا کام ہے شائستگیِ غم دینا
دل کو یہ غم سے رِہائی نہیں دیتا یارو!

دل کی گہرائی سے محسوس کیا جاتا ہے
رشتۂ درد دِکھائی نہیں دیتا یارو!

سورج آتا ہے تو تاریک اُجالے لے کر
یہ اندھیروں سے رِہائی نہیں دیتا یارو!

تم ہو گرتی ہوئی دیوار کے سائے کی طرح
پھر بھی میں تم کو بُرائی نہیں دیتا یارو!

☆☆☆☆☆

جب کبھی رہبر ہمارا جذبۂ کامل بنا
ذرّہ ذرّہ راہ کا آئینۂ منزل بنا

روک لے پلکوں پہ ہی اِن آنسوؤں کو چشمِ تر
اپنے اِس طوفان کو آسودۂ ساحل بنا

میرے نالوں ہی نے بخشی، اہلِ دل کو زندگی
سوز میرا ہی متاعِ گرمیِ محفل بنا

اللہ اللہ یہ مری مشکل پسندی کا کمال
مسئلہ جو سامنے آیا وہی مُشکل بنا

حُسن کی آرائشوں میں کچھ اضافے ہوگئے
غازۂ رُخ، قطرۂ خونِ دلِ بسمل بنا

☆☆☆☆☆

پاکر تری نظر کا اشارہ کبھی کبھی
ہنسنے لگا ہے درد کا مارا کبھی کبھی

وارفتگیِ شوق کا عالم نہ پوچھیئے
خود ہی کو بے خودی میں پُکارا کبھی کبھی

یوں ساتھ رہ چُکی ہے مرے فکرِ روزگار
اُن سے بھی کرلیا ہے کنارا کبھی کبھی

ہنسنا پڑا ہے اُن کی خوشی کے لئے مجھے
کرنا پڑا ہے یہ بھی گوارہ کبھی کبھی

دردِ جگر نشاطِ ابد بن کے رہ گیا
یوں غم بنا ہے دل کا سہارا کبھی کبھی

☆☆☆☆☆

اُن کی چشمِ ناز کو میں ایک پیمانہ کہوں
کیوں کہوں میں جام و ساغر، ایک پیمانہ کہوں

کیوں حضورِ شمع جل جاتا ہے پروانہ کہوں
چھوڑیئے یہ راز ہے کیوں بے حجابانہ کہوں

شمع و پروانہ، گُل و بُلبُل کے قصے سُن چکے
اب اجازت ہو تو میں بھی اپنا افسانہ کہوں

☆☆☆☆☆

زباں ہماری سدا شُکر آشنا ہی رہی
ہمارا مقصدِ ہستی، تری رضا ہی رہی

حریمِ دل میں ہمارے اک آرزو کا چراغ
ذرا سی دیر جلا، مدّتوں سیاہی رہی

ہوا نہ کربِ مسرّت سے میں کبھی مرعوب
مجھے نصیب ترے غم کی بے پناہی رہی

لگائے لوگوں نے انبار قہقہوں کے بہت
مگر خلا جو دلوں میں تھی وہ خلا ہی رہی

اُمید بیچ گئے نا اُمیدیوں کے عوض
ہم اہلِ دل سے یہ دنیا مگر خفا ہی رہی

☆☆☆☆☆

اُن کا منشا اگر ایسا ہے تو ایسا ہی سہی
خونِ دل، خونِ جگر، خونِ تمنّا ہی سہی

سوزِ دل یوں تو اجازت نہیں دے گا لیکن
اُن کی خاطر جو ہو منظور تو ہنسنا ہی سہی

دل کے بہلانے کو صرف آپ کا غم کافی ہے
آپ جاتے ہیں تو بس جایئے ایسا ہی سہی

نگہہِ شوق، پسِ پردہ بھی محروم نہ ہو
ایسا پردہ ہو اگر مجھ سے تو پردہ ہی سہی

چارہ سازوں کو تو صحت کی کوئی آس نہیں
آپ اچھا مجھے کہتے ہیں تو اچھا ہی سہی

میرے دل میں تو کسک بھی ہے، تڑپ بھی، غم بھی
آپ دنیا کے لئے جانِ مسیحا ہی سہی

نہ سہی دل کی تڑپ، عشق کی مرہونِ کرم
آپ کی چشمِ فسوں گر کا کرشمہ ہی سہی

سوزِ دل کے لئے کیفیتِ غم لازم ہے
غمِ جاناں جو نہیں ہے غمِ دنیا ہی سہی

اُن کے اندازِ تغافُل کی شکایت نہ کرو
کچھ تو ہاتھ آئے، تڑپنے کا سلیقہ ہی سہی

میرے دل میں ہے متاعِ غمِ اُلفت ساجدؔ
میں زمانے کی نگاہوں میں تماشہ ہی سہی

☆☆☆☆☆

رہِ حیات میں جب ہم وفا شعار چلے
نظر بچا کے ستم ہائے روزگار چلے

تمہاری بزم میں آئے تھے، ہم سکوں کے لئے
مگر یہاں سے بھی لے کر غموں کا بار چلے

وہ چاہتے ہیں کہ غم سے بھی اُن کے ربط نہ ہو
ہم آج اپنی متاعِ حیات ہار چلے

ہو جسکے بعد نہ احساس تلخیِ غم کا
وہ دورِ جام چلے اور بار بار چلے

ہمیں نے صَرفِ گُلستاں کیا لہو اپنا
ہمیں چمن سے لئے حسرتِ بہار چلے

غمِ حیات کے قصّے نہ چھیڑ اے ساجدؔ!
یہ بزم وہ ہے جہاں صرف ذکرِ یار چلے

مطمئن دوریِ منزل سے جو دیوانے ہیں
لذتِ سعیِ مُسلسل وہی پہچانے ہیں

گردشِ وقت سے کچھ دیر کی مہلت لے لیں
اُن کے اُلجھے ہوئے گیسو ہمیں سُلجھانے ہیں

کاش طوفان کی یورش ہو کبھی ساحل تک
اہلِ ساحل ابھی طوفان سے بیگانے ہیں

میرے ماضی کا پتہ پوچھنے والو دیکھو!
میری آنکھوں میں یہ آنسو نہیں افسانے ہیں

چشمِ ساقی جو ہے بدظن، تو یہ ہوتا ہے گُماں
جیسے میخانے میں شیشے ہیں نہ پیمانے ہیں

ہائے اُن کا مری فریاد پہ یہ کہہ دینا
آپ دیوانے ہیں، دیوانے ہیں، دیوانے ہیں

ترکِ اُلفت کی قسم دل نے بہت ساتھ دیا
کیا ہوا اب وہ اگر شرطِ وفا مانے ہیں

قسمت سے ذوقِ جہدِ مُسلسل اگر ملے
ہر شامِ زندگی بہ ادائے سحر ملے

محسوس پھر ہو رُکتی ہوئی نبضِ کائنات
اک بار اور اُن کی نظر سے نظر ملے

ہم موت کو گلے سے لگالیں بصد خوشی
فرصت جو زندگی سے ہمیں لمحہ بھر ملے

اے بادِ نوبہار گُل و لالہ کی قسم
کچھ تو قفس میں ہم کو چمن کی خبر ملے

اب جاگنے لگی ہے، تمنائے شوقِ یار
اب میری جُستجو کو جہانِ دِگر ملے

ساجدؔ خوشی ملی تو ہر اک لب پہ آگئی
یہ کون جانتا ہے کہ غم کس قدر ملے

میری دنیا میں مسرّت کا پتہ بھی تو نہیں
اِس کا احساس مگر اُن کو ذرا بھی تو نہیں

منزلِ دار عجب کیا ہے، جو ویران سی ہے
سر پھرا کوئی زمانے میں رہا بھی تو نہیں

میری وحشت سے کہو اور ذرا صبر کرے
چاکِ داماں کو ابھی میں نے سِیا بھی تو نہیں

ہم نے سوچا تھا کہ آرائشِ غم کرلیں گے
کوئی موتی تری پلکوں پہ رُکا بھی تو نہیں

مے کشی کو مری دیکھو، کہ ابھی تک میں نے
چشمِ ساقی کی قسم، جام چُھوا بھی تو نہیں

تُم اُسے اپنی کہانی ہی سمجھتے لوگو!
میرا افسانۂ غم تم نے سُنا بھی تو نہیں

حسرتِ ہم سفری کیسی، کہاں کی منزل
راستے میں کوئی نقشِ کفِ پا بھی تو نہیں

چشمِ پُر نم کی قسم، غیرتِ گریہ کی قسم
اُن کے دامن پہ کوئی اشک گرا بھی تو نہیں

آپ کیوں رسمِ وفا ڈھونڈھ رہے ہیں ساجدؔ
آج دنیا میں کہیں ذکرِ وفا بھی تو نہیں

☆☆☆☆☆

اندھیارے آتے ہی نہیں، اپنی بستی کی فضاؤں میں
دل کا دِیا جلتا رہتا ہے، طوفاں خیز ہواؤں میں

بھولے بھالے، سیدھے سادے، لگتے ہیں پر کس کو خبر
کتنے سراب چھپے بیٹھے ہیں، چہروں کے صحراؤں میں

مہر، وفا، ایثار، مروّت، ضبط، محبت، غم خواری
آخر کتنی زنجیریں ہیں، اک بیکس کے پاؤں میں

ناکامی، مایوسی، حسرت ہر دم اس کے ساتھی ہیں
کون ہے اپنے دل جیسا، دنیا کے بزم آراؤں میں

کیسے ممکن ہے ہر اک کو، پیار کسی کا مِل جائے
پاگل مَن پھر بھی ڈوبا رہتا ہے انھیں آشاؤں میں

آنکھ سے گر جائیں تو دھرتی پی جائے پانی کی طرح
موتی ہیں وہ اشک رہیں جو پلکوں کی سیماؤں میں

کچھ پتھریلی یادیں تھیں اور چند فلک بوس امیدیں
شہر کی ہر تصویر جلادی آکر ہم نے گاؤں میں

دو اک لمحوں کی عشرت ہیں شوقِ تمنا، ذوقِ طلب
عمر بھلا کیسے کٹ جاتی ارمانوں کی چھاؤں میں

☆☆☆☆☆

بڑے حسین مقدر اُنہوں نے پائے ہیں
جنہیں نصیب ترے گیسوؤں کے سائے ہیں

عجیب طرح سے غم مجھ کو راس آئے ہیں
سُنا ہے وہ مری وحشت پہ مُسکرائے ہیں

جو تیر غم کی اداؤں میں ڈھل کے آئے ہیں
وہ حادثات نے مجھ پر ہی آزمائے ہیں

غمِ حیات کو سمجھا ہے جب امانتِ دوست
رموزِ راہِ وفا تب سمجھ میں آئے ہیں

رُخِ حیات کی سُرخی ہمارے خون سے ہے
ہمیں تو ہیں جو سرِدار مُسکرائے ہیں

خدا گواہ کہ بن کر رہے ہیں مہر و نجوم
وہ اشک جو سرِ راہِ وفا بہائے ہیں

ہمیں زمانے سے خوشیاں تو چند مِل پائیں
کِسے خبر ہے کہ غم کس قدر اُٹھائے ہیں

☆☆☆☆☆

سوچتے سوچتے تھک جائیں گے، میرے احباب
پھر بھی مجھ کو نہ سمجھ پائیں گے، میرے احباب

اب تو وہ مجھ کو بڑے شوق سے برباد کریں
لیکن انجام پہ پچھتائیں گے، میرے احباب

میں نے ہر بار تسلّی ہی غلط دی دل کو
کیا خبر تھی کہ نہیں آئیں گے، میرے احباب

مجھ کو تنہائی کا ماحول تو راس آ ہی چکا
آ کے اب کیا مجھے سمجھائیں گے، میرے احباب

جانے جب بار اُٹھائیں گے مرا کاندھوں پر
جانے کب مجھ پہ ترس کھائیں گے، میرے احباب

دلِ ناداں نے کچھ اِس طرح پُکارا اُن کو
جیسے دوڑے ہی چلے آئیں گے، میرے احباب

شیشۂ دل کی نُمائش تو میں کردوں لیکن
آئینہ دیکھ کے شرمائیں گے، میرے احباب

مجھ پہ کیا کیا کرمِ خاص کیا ہے سب نے
صاف کہہ دوں تو بگڑ جائیں گے، میرے احباب

بات چھیڑوں گا اگر شرطِ وفا کی ساجدؔ
میرے سائے سے بھی کترائیں گے، میرے احباب

☆☆☆☆☆

اے شمع تجھ کو آج یہ رُسوا کرے گا کیا
پروانہ ہے یہ، جان کی پروا کرے گا کیا

دشمن ہزار ہوں مجھے پروا نہیں ذرا
تم میرے ساتھ ہو تو زمانہ کرے گا کیا

اے اہلِ ہوش! بڑھ کے زمانے کو روک لو
مجھ کو ستائے گا تو یہ اچھا کرے گا کیا

جس نے سمجھ لیا ہے ترے غم کو زندگی
وہ آج تیرے غم سے کنارا کرے گا کیا

جو سر بکف چلا ہو محبت کے راہ میں
بربادیِ حیات کا شکوہ کرے گا کیا

ہر غم کو میں نے عیش سمجھ کر اُٹھا لیا
جو میں نے کرلیا وہ زمانہ کرے گا کیا

اے دل! تو اُن کے رُخ سے نقاب آج اُلٹ بھی دے
حسرت بھری نظر سے ہی دیکھا کرے گا کیا

کچھ اضطراب میں مجھے لذّت ملی تو ہے
اب میرا دل سکوں کی تمنّا کرے گا کیا

تو اپنے اشک پی بھی لے، اے دیدۂ فراق!
اب اُن کے سامنے مجھے رُسوا کرے گا کیا

کہدو مرے جنوں سے ذرا جوش کم کرے
یہ آج میرے گھر کو ہی صحرا کرے گا کیا

عہدِ وفا ہے عمر سے بس آج تک مرا
اب آپ کا یہ وعدۂ فردا کرے گا کیا

ساجدؔ کسی کے سامنے اظہارِ غم نہ کر
ترکِ تعلّقات کا چرچا کرے گا کیا

☆☆☆☆☆

ترے بغیر ہر اک شے بُری لگے ہے مجھے
کہ چاندنی بھی تو تپتی ہوئی لگے ہے مجھے

عجیب حال ہے ترکِ تعلّقات کے بعد
کہ اپنے دل کی کہانی نئی لگے ہے مجھے

تمہاری زُلف کے سائے خدا دراز کرے
کہ موت بھی تو یہاں زندگی لگے ہے مجھے

نظر جو آتا ہے ہنستا ہوا کوئی چہرا
ہنسی کہیں سے چُرائی ہوئی لگے ہے مجھے

اِن آئینوں کو مرے سامنے سے لے جاؤ
کہ اپنی شکل بھی اب اجنبی لگے ہے مجھے

نہ جانے کتنے زمانے گزر گئے ساجدؔ
جگر کی چوٹ ابھی تک ہَری لگے ہے مجھے

☆☆☆☆☆

مہرباں مجھ پہ بہت ہی غمِ جاناں نکلا
دشمنِ جاں جسے سمجھے تھے نگہباں نکلا

بوئے اُلفت ہے گُلوں میں، نہ کہیں رنگِ وفا
کیا عجب دیکھئے انجامِ بہاراں نکلا

ہم نے سوچا تھا غمِ زیست ہے، سرمایۂ زیست
قرعۂ فال بنامِ غمِ جاناں نکلا

جب بھی تیرا کرمِ خاص ہوا عام اے دوست!
ہر زباں سے گِلۂ تنگیٔ داماں نکلا

ہم نے تیرِ غمِ جاناں پہ ملامت کی تھی
دل سے پوچھا تو وہ شرمندۂ احساں نکلا

اب وہی مشورۂ ترکِ وفا دیتا ہے
ہم کو جس دل پہ بھروسہ تھا وہ ناداں نکلا

☆☆☆☆☆

جُرمِ اُلفت کی سزا کے وہ سزاوار نہیں
میں گُنہگار ہوں، لوگو وہ گنہگار نہیں

یہ خطا موت کی ہے، آپ خطاوار نہیں
آپ پر خون کا دعویٰ، نہیں سرکار نہیں

ہاتھ میں اُس کے سراپردۂ اسرار نہیں
جس کے سینے میں متاعِ دلِ بیدار نہیں

وہ بھی کیا آنکھ، ڈھلیں جس میں نہ موتی غم کے
وہ بھی کیا دل کہ جو لذّت کشِ آزار نہیں

ہائے یہ شہرِ نگاراں کا نرالا دستور
جنسِ دِل کی کوئی قیمت سرِ بازار نہیں

عشق کرنا ہی نہ تھا اے دلِ آرام طلب!
یہ وہ بستی ہے جہاں سایۂ دیوار نہیں

سرفروشی کی ادا بھول گئے دیوانے
عام یونہی تو مذاقِ رسن و دار نہیں

گو تباہی ہے مری مرحلۂ آخر میں
دل مگر شِکوہ گُزارِ نگہہِ یار نہیں

زیست کو بار سمجھنے کا نہیں کوئی جواز
زیست فطرت کا تقاضہ ہے کوئی بار نہیں

موت آتی ہوئی شرمائے، جیو کچھ ایسے
جاں نثاری ہی فقط عشق کا معیار نہیں

کئے پھرتا ہوں چراغاں سرِ مژگاں ساجدؔ
یہ وہ موتی ہیں کوئی جن کا خریدار نہیں

☆☆☆☆☆

ان فضاؤں میں بھی جینے کی دعا دیتے ہیں
کیا وہ ناکردہ گناہوں کی سزا دیتے ہیں

آج وہ ترکِ تعلق کی سزا دیتے ہیں
زندگی بھر کی وفاؤں کا صِلہ دیتے ہیں

میرے آنسو ہی فقط ساتھ مِرا دیتے ہیں
دل میں جو آگ بھڑکتی ہے بجھا دیتے ہیں

کم سے کم ہم کو تڑپنے کا سلیقہ آیا
ہم ترے طرزِ تغافل کو دعا دیتے ہیں

وہ حَسیں ہیں تو سزا بھی اُنہیں ملتی ہے حَسیں
لوگ اُن کو مرے اشعار سُنا دیتے ہیں

ہم ترے نام پہ پی لیتے ہیں تلخابۂ غم
گردشِ وقت کو دیوانہ بنا دیتے ہیں

ناقدوں کا یہ کرم کم تو نہیں ہے ساجدؔ
طنز کرتے ہیں تو جینے کی ادا دیتے ہیں

☆☆☆☆☆

اُن کی تمنّا کرنے والے پہلے جاں قُربان کریں
شرط یہ ہو تو ختم ابھی ہم رشتۂ جسم و جان کریں

ترکِ تعلّق کرنے والے اور اتنا احسان کریں
ترکِ تعلّق کا چرچا بھی آج علی الاعلان کریں

شیخ و برہمن، دیر و حرم میں صدیوں سے اک رنجش ہے
رِند بھلا کیوں جان کو اپنی اس غم میں ہلکان کریں

مے نوشی کا اذن ہمیں مِل جائے جو چشمِ ساقی سے
بستی بستی، صحرا صحرا مستی کا اعلان کریں

ایک ہتھیلی پر آنسو ہوں، ایک پہ قطرے شبنم کے
آپ ذرا پھر غور سے دیکھیں، موتی کی پہچان کریں

تم اپنا کچھ حُسن ملاؤ، ہم اپنے اخلاص و وفا
آؤ پھر دِل کے شیشے میں ان سب کو یکجان کریں

ہم آنکھوں میں بسا تو لیں دنیا کے ہر ویرانے کو
دنیا والے جانے پھر کس بستی کو ویران کریں

چاک کریں ہم جیب و گریباں کچھ تو ساجدؔ شغل رہے
آؤ کچھ دنیا والوں کے ہنسنے کا سامان کریں

☆☆☆☆☆

کیوں یہ دستور زباں بندی تری محفل میں ہے
مُہرِ خاموشی ہے لب پر بات دل کی دل میں ہے

ہم نے تیرا حکم مانا اُٹھ گئے محفل سے ہم
آج پھر اتنی اُداسی کیوں تری محفل میں ہے

لذّتِ سعیِ مسلسل اور اخلاصِ عمل
قُربِ منزل میں نہیں ہے، دوریِ منزل میں ہے

موجِ طوفاں میں ہے میرے واسطے ایسی کشش
اور لوگوں کے لئے جو دامنِ ساحل میں ہے

آج کی یہ رات ساجدؔ دیکھئے کیسے کٹے
شام ہی سے ایک انجانا سا خدشہ دل میں ہے

☆☆☆☆☆

شامِ غربت ملے یا ظلمتِ صحرا آجائے
ابھی چلتا ہوں ذرا کوئی تو اپنا آجائے

چاہے کچھ آئے نہ آئے، مگر اِس دنیا کو
چاکِ داماں سے اُلجھنے کا سلیقہ آجائے

چال پر اپنی سُنا ہے کہ صبا کو بھی ہے ناز
دیکھ لے محوِ خرام اُن کو تو چلنا آجائے

پُر سکوں بھی ہو تڑپنے کی بھی اِس میں ہو ادا
دل تو ہے ایک، بتاؤ اسے کیا کیا آجائے

زیست کو غم کی اداؤں میں تو ڈھالو لوگو!
لذتِ غم جو میسّر ہو تو جینا آجائے

چاک ہو جائے جو اُن کا بھی گریباں ساجدؔ
وحشتِ دل کا مرے ہاتھ بہانہ آجائے

☆☆☆☆☆

ترانہ

اے وطن میرے وطن .... تجھ سا نہیں کوئی چمن
اے وطن میرے وطن
تجھ پہ قُربان مری جان، مرا تن، مرا من
اے وطن میرے وطن
تیرا ہر ذرّہ ہے اک سلسلۂ شمس و قمر
کہکشاں میرے لئے ہے تری ہر راہ گزر
تیرے ہر کوچے میں کِھلتے ہیں محبت کے چمن
اے وطن میرے وطن
گُنگُناتی ہوئی دریائیں ہیں ثروت تیری
لہلہاتے ہوئے یہ کھیت ہیں دولت تیری
تیری سونے کی ہے دھرتی، ترا چاندی کا گگن
اے وطن میرے وطن
شمع جلتی ہے وفا کی ترے ایوانوں میں
پھول کھلتے ہیں وہی تیرے گلستانوں میں
جن سے قائم ہے زمانے میں مہکنے کا چلن
اے وطن میرے وطن

تیری دھرتی کا محافظ ترا ہر پیر و جواں
گرمیِ حُبِّ وطن سب کے دلوں میں پنہاں
سب ہی تیار ہیں کرنے کو فِدا تن، من، دھن
اے وطن میرے وطن

ہمیں رکھنا ہے بھرم اب تری آزادی کا
ناز اُٹھانا ہے ہر اک، امن کی شہزادی کا
آج پیغام یہی لائی ہے سورج کی کرن
اے وطن میرے وطن

☆☆☆☆☆

علامہ اقبالؒ کو نذرِ عقیدت

اُنہیں کی ترکیبوں کے ساتھ

کہاں میں اور کہاں تیرا رتبۂ عالی
ترے حُضور مجھے لائی ہے خوش اقبالی

خودی کے راز کی تشریحِ دلنشیں تو ہے
رموزِ بے خودیِ شوق کا امیں تو ہے

توہّمات کی ضِد، فِکر بے پناہ تری
فرازِ مَسندِ خورشید تکیہ گاہ تری

چُھپی ہوئی ہے ہر اک بات میں تری اک بات
بجا کہ دیدۂ بینائے قوم ہے تری ذات

شُعاعِ مَشعلِ وحدت ہے تیری فِکرِ بلیغ
محیطِ عالمِ کثرت ہے تیری فکرِ بلیغ

خودی کو صورتِ فولاد کردیا تونے
جہانِ عشق کو آباد کردیا تونے

بہ شعر سوزِ رسالت کا ترجمان ہے تو
زمینِ شعر کا بے شُبہہ آسمان ہے تو

پیمبری کا تو ملنا ہے ممکنات سے دور
مِلا ہے لَمسِ پرِ جبرئیلؑ تجھ کو ضرور

جہاں کو فلسفۂ عشق تونے سمجھایا
دلوں کو شعر کی گرمی سے تونے گرمایا

حقیقتوں کی خبر، ذہنِ نکتہ بیں تیرا
طلوعِ مہر طلب غازۂ جبیں تیرا

خودی کا درس ترے جذبۂ وفا نے دیا
شعورِ زیست ہمیں تیرے نقشِ پا نے دیا

ترے پیام میں پوشیدہ عزمِ آزادی
ترے کلام سے ہے گرم، رزمِ آزادی

ترے شعور کو کب وقت کر سکا مرعوب
ترا یقین گماں سے نہ ہو سکا مغلوب

سکون دے گئیں غم آشنائیاں تیری
ہمیں جگا گئیں آتش نوائیاں تیری

دیارِ کفر میں وحدانیت کا نغمہ ہے
تری فغاں میں بھی انسانیت کا نغمہ ہے

گلِ حقیقتِ خفتہ، کھِلا غزل میں تری
سُراغِ آتش رفتہ ملا غزل میں تری

تری نوا نے بتائی ہمیں فلاح کی راہ
بنایا درسِ خودی نے گدائے شہر کو شاہ

نشانِ منزل و دانائے راہ فقر ترا
دلیلِ عفتِ قلب و نگاہ فقر ترا

جنونِ عشق سے تیرے مٹے غرور و نفاق
تری خودی نے کیا تجھ کو شاعرِ آفاق

اگر نصیب ہو تیرا شعورِ عشق ہمیں
خودی کی راہ دکھائے غرورِ عشق ہمیں

فلاح پاتا ہے تجھ سے ہر ایک عصیاں کوش
ترا وجود ہے مثلِ سحابِ بحر بدوش

تری نظر عُمقِ بحرِ عشق کی مُخبر
تری نوا سے یہ ذہنوں پہ ہوگیا ظاہر

جو عشقِ مصطفویؐ دل میں بزم آرا ہے
شرار بولہبی صرف اک شرارہ ہے

خرد کا شوقِ تجسّس نہ علمِ کج رفتار
کُشادِ دل کے لئے سوزِ عشق ہے درکار

طفیلِ شاعرِ مشرق خدا سے ہے یہ دُعا
عطا ہو ساجدِ بے بہرہ کو بھی ذہنِ رَسا

☆☆☆☆☆

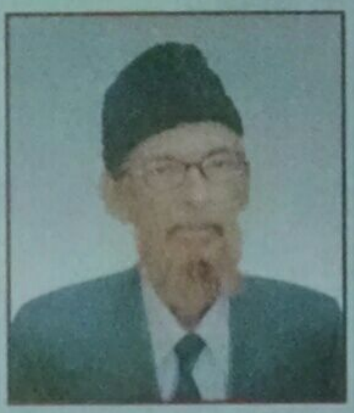

ساجدؔ امروہوی

خانوادۂ رؤفؔ امروہوی کی تصانیف

لہورنگ	سیفیؔ امروہوی	غزلیات
نکہتیں	سیفیؔ امروہوی	حمد ونعت
مدحت کے پھول	حامدؔ امروہوی	حمد، نعت ومناقب
خیابانِ ارم	حامدؔ امروہوی	حمد، نعت ومناقب
جوئبارِ بخشش	حامدؔ امروہوی	حمد، نعت ومناقب (اردو اور رومن رسم الخط)
انوارِ رؤف	مرتبہ: ساجد حسین	حمد ونعت
رازِ بخشش	ساجدؔ امروہوی	حمد ونعت
آرزوئے بخشش	ساجدؔ امروہوی	حمد ونعت
گہرِ بخشش	ساجدؔ امروہوی	حمد، نعت ومناقب
دسترس	ساجدؔ امروہوی	غزلیات
متاعِ مخفی	کلام مخفی امروہوی مرتبہ: حامدؔ امروہوی	غزلیات
سرمایۂ رؤف امروہوی	مرتبہ: حامدؔ امروہوی	حضرت رؤف امروہوی کی تصانیف ''نخلۂ محامد''، ''گل رنگ تخیل''، ''کوثر رحمت'' اور ''اپنی زبان سے میں'' کا انتخاب

Available at : **Mirza Sajid Husain Sajid Amrohvi**
Mohalla Saddo, Amroha-244 221 (U.P.) India